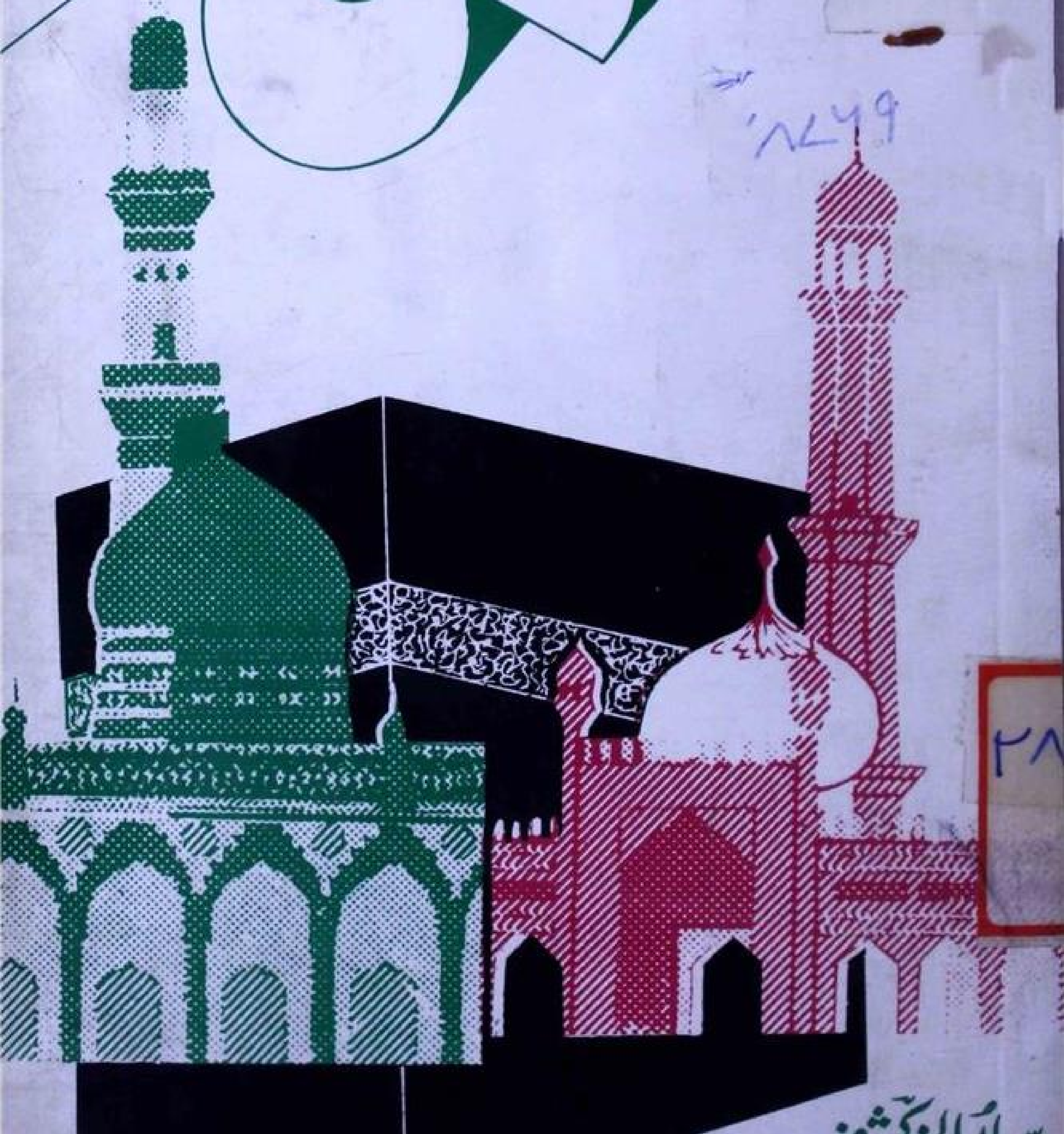


سید ابوالخیر کشفی

وطن سے وطن تک

(سرزمینِ حجاز کے تاثرات)

سیّد ابوالخیر کشفی

مجلسِ مطبوعات وتحقیقاتِ اردو جامعہ نگر۔ جامعہ کراچی

(جملہ حقوق پڑھنے والوں کے حق میں محفوظ)

نام کتاب : وطن سے وطن تک

اشاعت اول : ۱۴۰۶ھ (۱۹۸۶ء)

قیمت / ۱۸ روپے

ناظم اشاعت : میر صاحب، الحمرا پبلی کیشنز،

مطبع - احمد برادرز ناظم آباد کراچی

کتاب نما

انتساب

• انہوں نے جب بھی سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کا نام لیا تو آواز آنسوؤں میں ڈوب گئی

— وہ میرے والد تھے سید ابو محمد ثاقب کانپوری

• اُن کے لئے آقائے دوسرا محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم نے خواب میں فرمایا کہ مارچ سے پہلے اُن کے دکھ ختم ہو جائیں گے۔ اور ختم ہو گئے

— وہ تھے عبدالکریم سومار

• یہ میرے دوست ہیں۔ سالانہ نعتیہ مشاعرہ اور نامِ رسولِ مدنی صلی اللہ علیہ وسلم پر اضطرابِ ان کی شناخت ہیں

— یہ ہیں الحاج حبیب احمد

• یہ میرے ایک محترم بھائی ہیں۔ جب یہ حضرت زبیر رضی اللہ عنہ کے مزار پر حاضر ہوئے تو صاحبِ مزار نے "السلام علیکم یا ابنِ رسول اللہ" کہہ کر ان کا استقبال کیا

—— یہ ہیں سید جمیل نقوی

• یہ ایک شاعرِ پاک نہاد مگر آزادہ رو ہے اور اب نامِ سرکار نے اس کی زندگی کو نیا قرینہ دیدیا ہے

—— یہ ہے تسلیم کوثر

• حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے نام پر ان کے ہونٹوں پر تبسم آنکھ میں نمی

—— یہ ہیں میرے پیارے دوست جلیل احمد صدیقی اور ڈاکٹر منظور قریشی

• یہ ایک نفیس آدمی جب بھی دربارِ تاجدارِ اُمم میں حاضری دیتا ہے تو اسے ایک نیا نعتیہ مجموعہ عطا کیا جاتا ہے

—— یہ ہیں سرور کیفی

میں یہ چھوٹی سی کتاب ان ناموں کے نام منسوب کرنے پر ان سے بھی محجوب ہوں اور اُس ذات کے سامنے بھی شرمندہ ہوں جس نے مجھے ان سے پیوستہ کر دیا ہے۔

ابوالخیر کشفی

سفر سے پہلے

زندگی خود ایک سفر ہے ___ اور زندگی اپنے سفر میں ہماری ذات کی منزلوں سے گزرتی ہے ___ دوسری سطح پر ہم عشق کا مظہر بن کر مسافر اور سالک ہو کر زندگی کے خارج اور باطن میں سفر کرتے ہیں۔

ع عشق ہے ابن السبیل اس کے ہزاروں مقام

زندگی کے اس سفر کو لوگ اپنی خود نوشت سوانح عمریوں میں پیش کر سکتے ہیں یا ادب کی دوسری اصناف اور بالخصوص شعر کے پردے میں پیش کرتے ہیں۔ یہ وہ مقام ہے جہاں کوئی کتاب، کوئی مصنف خود ایک برِاعظم بن جاتا ہے۔ محبوب کی جستجو اور اس کا خیال بھی تو ایک برِاعظم ہی ہے عاشق کے لئے، اور کسی کی نظروں کا قافلہ ساری عمر اسی برِاعظم کے مقامات کی دریافت کرتا رہتا ہے

میں نے بھی حسبِ توفیق ایسے سفر کئے ہیں جن کا ذکر سطورِ بالا میں کیا گیا ــــ اور آج میں گیارہ سال پہلے اپنے اس سفر کو یاد کرنے بیٹھا ہوں جو کراچی سے شروع ہو کر کراچی پر ختم ہوا تھا ــــ یہاں میں سفر کو استعارہ کے طور پر نہیں بلکہ لغت کے معنوں میں استعمال کر رہا ہوں۔ ویسے اس سفر میں بھی "باطنی" سفر کی جھلکیاں تو آہی جائیں گی ــــ آدمی ناقابلِ تقسیم وحدت ہے ــــ میں اپنے وجود کے ٹکڑے نہیں کر سکتا، بکھر سکتا ہوں ــــ اور پھر بکھرنے کے بعد ہم آپ، سب ہی اپنی شیرازہ بندی کر لیتے ہیں۔

اپنی خاکستر سمندر کو ہے سامانِ وجود

میں ۸ ستمبر ۱۹۶۶ء کو کراچی سے اپنے ننھے ہم سفر عاکف سلمہٗ (میرا بیٹا) کے ساتھ روانہ ہوا تھا اور فروری ۱۹۶۸ء میں واپس لوٹا تھا۔ تقریباً ڈیڑھ سال کی اس مدت میں کئی امصار و ولایات کو دیکھا، اور بڑی مدت امریکہ میں گزاری ــــ امریکہ اور دوسرے ملکوں کے تاثرات پھر کبھی پیش کروں گا۔ کبھی کبھی یہ تمنا بھی پیدا ہوتی ہے کہ اب "بازدید" کے بعد اپنے تجربات قلم بند کروں۔ وہی بات سفرِ حجاز کی، سو کہہ نہیں سکتا کہ ان نقوشِ نظر کو کیسے الفاظ کا پیراہن مل گیا۔

میں یہ عرض کر دوں کہ میں نے کہیں کوئی نوٹ مرتب نہیں کئے، کوئی یادداشت نہیں لکھی ــــ میرا خیال ہے کہ یہ دُوری اپنے ذاتی مشاہدات، احوال اور کوائف کے باب میں ضروری ہے۔ آدمی جب کسی تجربے سے گزرتا ہے، خواہ وہ محبت ہو یا کسی نئی سرزمین کا سفر، تو اسے اپنا ہر مشاہدہ، ہر تجربہ ایک عظیم سرمایہ معلوم ہوتا ہے ــــ اس تجربہ

کی قدر و قیمت کا تعین وقت گزرنے کے بعد ہی ہو سکتا ہے ___ پہاڑ ہو یا مصوری کا کوئی نمونہ، یا ذاتی زندگی کے نئے تجربات ___ ان سب کو دیکھنے کے لئے مناسب دُوری ضروری ہے ___ یہی میرے نزدیک تناظر کا حقیقی مفہوم ہے۔

حجاز محض ایک سرزمین نہیں، یہ تو میرے ایمان کا مرکز ہے، اسی لئے وہ جلوے وہ مناظر ماضی کا حصّہ نہیں بنے بلکہ یاد میں تازہ ہیں اور تازہ رہیں گے ___ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ خانۂ کعبہ اور گنبدِ خضریٰ کی دید میں نئے پہلو وقت بیتنے کے ساتھ پیدا ہو رہے ہیں۔

سفر کے آغاز میں آپ کو ایک ذاتی تمہید، بلاتفصیل نظر آئے گی ___ کہیں اشاروں میں، کہیں سیدھے سادھے انداز میں ___ میرا خیال ہے کہ اس ذاتی تمہید کے بغیر میرے سفرِ حجاز کی معنویت آشکار نہیں ہو سکتی تھی۔ امید ہے کہ اس تمہید کے لئے آپ، میرے عزیز، اور بلقیس ___ سب مجھے معاف کر دیں گے۔

ابوالخیر کشفی

۲۰ رجولائی ۱۹۷۹ء

پسِ تحریر ......

آغازِ سفر کے کئی ٹکڑے نہ جانے بلقیس نے کب کاٹ دیئے اور یوں کہ پڑھے نہیں جاتے مگر شاید اتنی بے ربطی پیدا نہیں ہوئی کہ مفہوم خبط ہو جائے۔

...... نسبی تفاخر پہ ہزار لعنت کہ سیدِ عرب و عجم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ عربی کو عجمی پر اور عجمی کو عربی پر، سیاہ کو سرخ پر اور سرخ کو سیاہ پر کوئی فوقیت نہیں سوائے تقویٰ کے۔ لیکن اس گھڑی میں نے اپنے آپ سے یہی کہا۔ "حضورؐ سے جو نسبتِ نسب ہے اس کا تقاضا یہی ہے کہ رضائے رب کو ہونٹوں کی مسکراہٹ اور سجدے کی سربلندیوں کے ساتھ قبول کیا جائے اور میں اپنے رب کے سامنے سربسجدہ ہو گیا اور پھر اُس نے میرے قلب پر سکون نازل فرمایا۔ ویسے اس مرحلہ پہ یہ بھی عرض کر دوں کہ زندگی کے ہر مرحلے میں ؎

ہزار بار مجھے لے گیا ہے مقتل میں
وہ ایک قطرۂ خوں جو رگِ گلو میں ہے

آغازِ سفر

۱۹۵۵ء میں مجھے ایک غیر ملکی وظیفہ ملا، پھر ۱۹۵۶ء میں اطالیہ میں اردو پڑھانے کی ایک ملازمت مجھے پیش کش کی گئی ـــــ دونوں موقعوں پر مجھے یہ خیال آیا کہ اگر غیر ملکیوں نے مجھ سے پوچھا کہ تمہارا ملک کیسا ہے تو میں کیا جواب دوں گا؟ اس شرمندگی سے اپنے آپ کو بچانے کے لئے میں نے وظیفہ قبول کیا، نہ ملازمت ـــــ اور پاکستان کو دیکھنے کے منصوبے بناتا رہا۔

۱۹۵۶ء میں ریڈیو پاکستان نے ایک دستاویزی پروگرام شروع کیا "بخدمتِ ملت" ـــــ اس پروگرام کے لئے مجھے اسکرپٹ رائٹر کے طور پر چنا گیا اور اس کے پروڈیوسر تھے میرے دوست خالد لطیف ـــــ اس پروگرام کی خاطر ہم دونوں کم و بیش سترہ دن ہر مہینے سفر کرتے ـــــ چارسدہ، تخت بائی اور پشاور سے لے کر چاٹگام تک ـــــ اب میں پاکستان کی زندگی اور مناظر کا شاہد بھی تھا اور مبصّر بھی۔ اس پروگرام کے دوران ہم نے پاکستان کے دیہاتوں اور دور دراز قصبوں میں جیسے بیدار ذہن اور بے قرار روحیں دیکھیں، ان کا تذکرہ پھر کبھی سہی۔

ارضِ پاکستان سے شناسائی کے بعد اب دور دراز کے علاقے مجھے اپنی طرف کھینچ رہے تھے۔ کبھی اسکینڈے نیویا میں "آفتابِ نیم شب" کو دیکھنے کی آرزو دل میں غنچہ کی طرح کھلتی، کبھی مجسمۂ آزادی مجھے نئی دنیا کے ساحلوں پر قدم رکھنے کی دعوت دیتا، کبھی ایشیا کی اُبھرتی ہوئی قدیم طاقت چین کی نئی زندگی کی تفہیم کی خواہش اتنی شدید ہوتی کہ "سینۂ شمشیر سے باہر ہے دم شمشیر کا" پر لفظاً یقین آجاتا۔ اور پھر سب سے شدید آرزو انگلستان میں جاکر برٹش میوزیم میں اپنے ملی اور ادبی آثار پر کام کرنے کی تھی۔ ۱۹۵۷ء میں طاہرہ میری زندگی میں داخل ہوئی اور ۱۹۵۸ء میں ہم دو سے تین ہوگئے۔ عاکف، ہماری زندگی کی ایک نئی سمت تھا ـــــ اب اکیلے سفر پر نکلنا خود غرضی معلوم ہوتا اور اُدھر طاہرہ اکثر کہتی "خیر جی! یہاں سے لے چلو۔ میں اس شہر میں زندہ نہیں رہ سکتی"۔ اور ایک دن احتجاجاً اس نے اپنی بات سچ کر دکھائی۔

۱۹۶۳ء تک تین بچے ہماری زندگی کے آنگن میں گلاب کے تین پھولوں کی طرح مہک رہے تھے ـــــ عاکف، عزمی اور اسامہ ـــــ ۲۳ اپریل ۱۹۶۳ء کی صبح عاکف اپنے اسکول گیا اور طاہرہ دوسرے دونوں بچوں کو لے کر ڈاکٹر حبیب الرحمٰن کے ہاں طبی معائنہ کے لئے گئی۔ ڈاکٹر صاحب کے گھر سے طاہرہ کا فون آیا "خیر جی! ذرا یہ تو بتایئے کہ مجاز کے اس شعر کا پہلا مصرع کیا ہے

ع خونِ دل نذرِ چمن بندیٔ دوراں کر دے"

میں نے پہلا مصرع بتا دیا

ع خونِ دل کی کوئی قیمت جو نہیں ہے تو نہ ہو

اور کہا "تم شعر پورا کرنے میں لگی ہو۔ مجھے یونی ورسٹی جانا ہے۔ فوراً آجاؤ"۔ میرے یہ لفظ، یہ تاکید اس کے لئے موت کا بہانہ بنے۔ طاہرہ جو کبھی رکشہ میں نہیں بیٹھتی تھی (میں نے رکشا میں نہ بیٹھنے کی قسم دلائی تھی) میری خاطر رکشا میں یونی ورسٹی کے لئے روانہ ہوئی اور سبزی منڈی پر رکشہ اور ٹرک کا تصادم ہوا اور یوں اس کا خونِ دل و حیات، چمن بندیٔ دوراں کے کام آگیا۔ عزمی اور اسامہ کی عمر بالترتیب تین سال اور سوا مہینے تھی، مگر اتنے ننھے بچوں نے موت کی وادی میں اپنی ماں

کا ساتھ نہ چھوڑا ــــ دونوں شفاعت کی سند بن کر اپنی ماں کو حضورؐ کی رحمت میں لے گئے۔

اس لمحے ایمان نے مجھے سہارا دیا۔ اللہ کا ذکر انسان کو اپنے غم سے بڑا بنا دیتا ہے، آدمی اپنے غم سے چھوٹا ہو تو پاگل ہو جائے یا خودکشی کر لے ــــ سول ہسپتال کے دروازے پر حسنین نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا تھا

؎ عرشِ معلی سے کم سینۂ آدم نہیں

ــــ نسبی تفاخر پر ہزار لعنت کہ سیدِ عرب و عجم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ عربی کو عجمی پر اور عجمی کو عربی پر، سیاہ کو سرخ پر اور سرخ کو سیاہ پر کوئی فوقیت نہیں سوائے تقویٰ کے ــــ لیکن اس گھڑی میں نے اپنے آپ سے یہی کہا "حضورؐ سے جو نسبتِ نسب ہے اس کا تقاضا یہی ہے کہ رضائے رب کو ہونٹوں کی مسکراہٹ اور سجدے کی سربلندیوں کے ساتھ قبول کیا جائے" اور میں اپنے رب کے سامنے سربسجدہ ہو گیا اور پھر اس نے میرے قلب پر سکون نازل فرمایا۔ ویسے اس مرحلہ پر یہ بھی عرض کر دوں کہ زندگی کے ہر مرحلے میں ؎

ہزار بار مجھے لے گیا ہے مقتل میں

وہ ایک قطرۂ خوں جو رگِ گلو میں ہے

طاہرہ کے بعد میں نے اپنے آپ کو سمیٹا ــــ اللہ مردہ زمین کو زندگی عطا کر دیتا ہے۔ ہیروشیما اور ناگاساکی ہی نہیں، میری ذات بھی اللہ کی اس صفت کی گواہی ہے۔ ہیروشیما اور ناگاساکی پر جوہری بم کے دھماکے کے بعد ماہرین کا کہنا یہ تھا کہ اب ان شہروں کی زمین کے سینے سے کبھی سبزہ نہیں پھوٹے گا۔ یہ زمین سبزہ، پھولوں اور کونپلوں سے ہمیشہ محروم رہے گی۔ لیکن اگلے ہی موسمِ بہار میں ویران زمین کی آغوش سے نمو کروٹیں لیتا ہوا ابھرا اور سبزہ و گل کا رنگ اور پیکر بن گیا۔

طاہرہ کے بعد میں ننھے عاکف کی انگلی پکڑ کر پھر سے زندگی کے سفر کی اگلی منزلوں کی طرف بڑھا ــــ اسی سفر میں چند قدم چلنے کے بعد ایک آواز سنائی دی اور یہ آواز میری مرشد بن گئی ؎

غم کیسے چھپاتے ہیں ، بتایا ہے کسی نے
لہجہ کا سکوں مرشدِ کامل کی طرح ہے
وسعت میں ، محبت میں ، لطافت میں ، نمی میں
اقبال کی آواز ترے دل کی طرح ہے

طاہرہ کا کفن بھی میلا نہیں ہوا تھا کہ میرے "دوستوں" بہی خواہوں اور ہمدرددل نے "عقدِ ثانی" کا نسخہ تجویز کرنا شروع کر دیا تھا ۔ یہ وہ لوگ تھے جو عورت کو بکری سمجھتے ہیں ۔ بکرا سیڑھی جا لیٹے اور کوئی سی بکری خرید کر لے آئیے ـــــ لیکن جب میں نے اس "آواز" کو اپنانے کے بارے میں اپنے خیال کا اظہار کیا تو جیسے زبانوں کے بند ٹوٹ گئے ـــــ میری غیبت میں مذاق اڑایا جاتا کہ " وہ محبت کے دعوے کہاں گئے ؟ " " دیکھو ! اب عاکف ہوگا اور سوتیلی ماں " ۔ باپ ، بیٹے اور گدھے کا قصہ میری زندگی بن گیا ـــــ اور چھوٹے سے قصے کی معنویت کی تہیں مجھ پر کھلتی گئیں ـــــ یہ قصہ معاشرہ اور اس کے برتاؤ کی علامت ہے ۔

وقت بہت آہستہ اور بہت تیزی کے ساتھ گزرتا گیا ـــــ دو سال بیت گئے ۔ تین سال بیت گئے ۔ میں ہر دن اسی راستے سے گزر کر شہر جاتا جس کا ایک ٹکڑا طاہرہ اور میرے بچوں کے خون سے گلنار بنا تھا ۔ اپنے شہر کے گلی کوچوں پہ مجھے دستِ قاتل کا گماں ہوتا ـــــ ایک طرف اپنی ذات میں شیرازہ بندی کے لئے یہ جنگ لڑ رہا تھا اور دوسری طرف میں نے اس "آواز" سے رشتہ جوڑنے کے لئے اپنا پیغام بھیجا ـــــ اسی کے ساتھ ساتھ طاہرہ کی آواز سنائی دی " مجھے اس شہر سے لے چلو " ۔

اسی دوران مجھے لسانیات کی تعلیم کے لئے فل برائٹ وظیفہ ملا ۔ میں نے امریکی تعلیمی فاؤنڈیشن والوں سے دو باتیں کہیں ، ایک تو میں سعودی عرب ہوتے ہوئے جاؤں گا اور دوسرے اپنے بیٹے کو ساتھ لے جاؤں گا ـــــ ورنہ یہ وظیفہ واپس قبول ہو ۔ ان دونوں باتوں کو تسلیم کرنے میں ان کے لئے بہت سی رکاوٹیں تھیں ـــــ ایک تو یہ کہ مجھے امریکی ہوائی کمپنی سے سفر کرنا تھا اور پین ایم کی کوئی پرواز سعودی عرب کے لئے نہ تھی دوسرے یہ کہ مجھے کولمبیا یونیورسٹی نیویارک میں

داخلہ ملا تھا ۔ امریکہ کا سب سے بڑا شہر اور کُل دو سو چالیس ڈالر ماہانہ کا اسکالرشپ ۔

امریکی قونصل خانے (بلکہ سفارت خانے) میں افسرِ راہ داری سے انٹرویو ہوا ۔ میں نے بتایا کہ اپنے بیٹے کے بغیر میں امریکہ میں نہیں رہ سکتا ۔ اور کبھی میں نے پہلے پاکستان دیکھنے کی خاطر غیر ملکی وظیفہ اور نوکری قبول نہیں کی تھی ، اور اب میں سب سے پہلے اُس دیار کو دیکھنا چاہتا ہوں ، جو میرا اور میری قوم کے تشخص کا ایک حصّہ ہے ۔ مسلمان اگرچہ قیدِ مقام سے آزاد ہے لیکن اگر قومیتِ اسلام کا کوئی مرکز ہو سکتا ہے تو وہ خاکِ بطحا اور دیارِ مدینہ ہے ۔ عجیب تھا وہ امریکی جس نے دو تین مرتبہ اپنی آنکھیں بند کیں اور جب کھولیں تو ایک نئی چمک کے ساتھ ــــ بولا " یقین کی طاقت سب کچھ بدل سکتی ہے ۔ تمہارے یقین نے میرے فیصلے اور ہمارے اصولوں کو بدل دیا ۔ تم پہلے سعودی عرب جاؤ گے اور تمہارا بچہ بھی تمہارے ساتھ جائے گا ۔ لاؤ اپنا پاسپورٹ "

یہ اگست ۱۹۶۶ء کے اواخر کی بات ہے ــ اور میں نے ۸ ستمبر کو کراچی سے روانگی کا فیصلہ کیا ۔ ۶ ستمبر کو جنگِ ستمبر کی پہلی سالگرہ آرہی تھی ۔ میں اس موقع پر اپنے لوگوں سے دور کیسے جا سکتا تھا ۔ ۶ ستمبر کو میں نے اس آواز کو اپنا لیا ۔ ۶ ستمبر کو میری قوم نے اپنے آپ کو پالیا تھا ۔ ۶ ستمبر کو میں نے اس آواز کو پالیا جو میری زندگی کا ایک نیا عنوان ٹھہری اور ۸ ستمبر کو جب میں ہوائی اڈے پر تھا تو .... میری ماں جائی حمیرا سینے سے لگ کر رو پڑی ــــ یہ آنسو نہ تھے ، بہار کی تازہ ہوا تھی ۔ ؎

تازہ ہوا بہار کی گردِ ملال لے گئی

اور یوں اس نکاح کے سلسلے میں ہم دونوں کے اختلافات ختم ہو گئے (آج حمیرا اور اس کی بھابھی کی چاہت کو دیکھتا ہوں تو حمیرا سے آنکھوں ہی آنکھوں میں پوچھتا ہوں ، بتاؤ میرا فیصلہ درست تھا نا)

سعودی ائیرلائنز کا طیارہ رن وے کے ایک دُور افتادہ گوشے میں جاکر کھڑا ہو گیا ، اور جہاز کی تین نشستوں میں کسی بیمار کو لے جانے کے لئے ردّ و بدل کا کام شروع ہو گیا ــــ ابھی ارضِ حرم کے لئے پرواز شروع بھی نہیں ہوئی تھی کہ جیسے زمان و مکاں کے حوالے بدل گئے ، باہم کششِ ثقل کے

اصولوں سے آگے نکل گئے ۔ فریدی ساتھ تھے، مگر اس درجہ خاموش، جیسے وہ خود بھی انہیں ذہنی کیفیتوں سے میرے ساتھ گزر رہے ہوں ۔

لوگوں کا استہزا، طنز یہ مبارک باد ہی نہیں بلکہ جیسے سارے رشتے ناتے پیچھے رہ گئے تھے اور بیت اللہ کے سفر کا آغاز ہی جیسے ہمیں نئی فضا میں پہنچا دیتا ہے ۔؏

نہ ہے زماں نہ مکاں لاالٰہ الا اللہ

مال و دولتِ دنیا اور رشتہ و پیوند کے بوجھ سے وجود الگ ہو گیا تھا اور اب کسی نئے چاند کے گرد چکر لگا رہا تھا، بلکہ یہ وجود اب چاند بن کر سورج کی روشنی کا امین اور عکس بردار بن گیا تھا ۔

کراچی کے ہوائی اڈے پر لمحات گزرتے رہے ـــ میں نے سب کے سامنے احرام نہیں باندھا تھا، حجاب آتا تھا ۔ ایک طرف ذوقِ پرواز کا یہ عالم کہ جی چاہتا تھا کہ سبب اور علت کے سارے قانون بدل جائیں اور میرا وجود میرے لئے پرِ پرواز بن جائے، دوسری طرف جب اپنے ایامِ گزشتہ مجھے آئینہ دکھاتے تو تمنا پیدا ہوتی کہ آغازِ سفر کے ساتھ ہی جسم و جاں کے رشتے منقطع ہو جائیں ـــ اور پھر میرا یہ سفر ایک ابدی سفر بن جائے ـــ وقت کے آخری لمحے تک میں مصروفِ سفر رہوں ؏

میں خود سفر پہ رہوں جسم دھول ہو جائے

اور میرا عزم میری نیت، میرا اجر بن جائے ۔

جہاز کے غسل خانے میں گیا ۔ وضو کیا ۔ لبوں پہ روح کی تمنا لفظوں کی صورت ابھر آئی

لبیک لبیک اللھم لبیک

میں نے احرام باندھا اور اب حال یہ تھا کہ لبیک لبیک کی صدائیں جسم اور روح کے ہر گوشے سے بلند ہو رہی تھیں ـــ زندگی کی ہر تمنا، صرف ایک تمنا کی صورت میں ڈھل گئی ۔ حاضری کی تمنا ـــ خواجہ عزیز الحسن مجذوب کا شعر ہے ؎

ہر تمنا دل سے رخصت ہو گئی
اب تو آ جا اب تو خلوت ہو گئی

اور ۸ ستمبر ۱۹۶۶ء کو تصوف کی اصطلاح "خلوت" کتابوں اور دوسرے کے تجربوں کے دائرے سے نکل کر میری زندگی کی حقیقت بن گئی ـــــ لیکن مجھے یوں محسوس ہوا جیسے کوئی تمنا دل سے رخصت نہیں ہوتی بلکہ کنیز بن کر خلوت گاہ کے در و بام کی تزئین کرتی ہے اور سب تمنائیں مل کر اس خلوت کدے کی تمنائے واحد بن جاتی ہیں ـــ کسی کی قربت کی تمنا، کسی کو دیکھ سکنے کے حوصلے کی دعا ـــــ یہ خلوت کدۂ دل پھر "کثرت سرائے جلوۂ موہوم" بن جاتا ہے۔ خواجہ میر درد نے اس پہ دکھ کا اظہار کیا ہے۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ خلوت کی منزل میں آدمی مستقل طور پہ رہ نہیں سکتا۔ یہ تجربہ ہماری ذات کی تعمیر کرتا ہے اور پھر جب ہم اس خلوت سے جلوت کی طرف آتے ہیں تو مختلف آدمی ہوتے ہیں، دوسروں کے ساتھ ہمارے رشتے بدل جاتے ہیں ـــــ اللہ سے یہ ذاتی رشتہ، انسانوں کے ساتھ ہمارے تعلق کو نئی بنیادوں پہ استوار کرتا ہے۔

یہ تجربہ الفاظ کی گرفت میں نہیں آ رہا ہے ـــــ وجدانی تجربہ کو علم کے دائرے میں لانے کی کوشش کی افادیت سے مجھے انکار نہیں، لیکن میں اس پر قادر نہیں ـــــ مگر سچ یہ ہے کہ یہ تجربہ حقیقتِ مطلقہ کو محسوس حقیقت بنا دیتا ہے اور پھر ہم اس کی روشنی میں کائنات کو سمجھنے اور جاننے کی کوشش کرتے ہیں۔

شام کو شاید چھ بجے فریدی نے آہستہ سے کندھے پہ ہاتھ رکھا اور رخصت ہو گئے۔ جہاز رن وے پہ دوڑنے لگا اور دوسرے لمحے وہ فضا میں بلند ہو چکا تھا ؏

نسیما! جانبِ بطحا گزر کن

اور مجھے محسوس ہوا کہ ہوائی جہاز وہ نسیم محبت ہے جو سوئے بطحا جا رہی ہے اور میں اس ہوا میں خوشبو کی طرح شامل ہوں

لبیک لبیک اللّٰھم لبیک

...... حضورؐ ! "عاشقانہ" اور "مستانہ" کے ٹکڑوں کے لئے مجھے معاف کر دیجئے۔ میں بے نوا ہوں ـــــ ہاں یہ جانتا ہوں کہ آپؐ نے ابوبکرؓ کو دیکھا تو وہ صدیق ہو گئے عمرؓ پہ نظر پڑی تو فاروقیت کے مرتبہ پر فائز ہو گئے، عثمانؓ آپؐ کی بزم میں آئے تو ہوا یہ کہ ہر دو جہاں سے بے نیاز اس کا دل غنی، علیؓ آپؐ کے سینے سے لگے تو باب العلم ہو گئے ـــــ سرکارؐ ! "عاشقانہ" اور "مستانہ" کے لفظوں پر اپنی خاکِ پا مل دیجیے تو یہ لفظ ستارے بن جائیں گے۔

لبیک لبیک

جہاز سوئے بیت اللہ پرواز کر رہا ہے۔ جہاز کی مخصوص آواز میرے لئے اجنبی نہیں تھی، مگر آج یہ آواز لبیک لبیک کی آواز بن چکی تھی۔ یہ جہاز بھی نازاں تھا کہ اتنے وجود اس کے سہارے بیتِ عتیق کی طرف محوِ پرواز تھے، مجھے یوں محسوس ہوا کہ ہماری خواہشوں اور آرزوؤں کو ایک آہنی اور محسوس و مشہود پیکر مل گیا ہے'۔ اور بوئنگ جہاز وہی پیکر ہے۔۔۔ یہ جہاز ہم ہم سے الگ کوئی چیز نہیں۔۔۔ یہ ہمارے ہی جذبات کی ایک معروضی شکل ہے۔ اب میرے ہونٹوں پہ لبیک لبیک کی آواز نہ تھی بلکہ یہ آواز میرے دل کی دھڑکن بن گئی تھی۔۔۔ میں نے ہمہ وقت ذکر کے سلسلے میں صوفیوں کا کتنا مذاق اڑایا تھا۔۔۔ اور آج پتہ چلا کہ

نوعِ دیگر بیں جہاں دیگر شود

ایں زمین و آسماں دیگر شود

اب خاموشی کے بطون سے اپنی حاضری کی صدائیں بلند ہو رہی تھیں۔۔۔ خانۂ کعبہ تک اس جسمِ خاکی کے پہنچنے سے پہلے ہی جذبہ کا طواف شروع ہو چکا تھا۔۔۔ میں اپنے جذبے کو بابِ حرم کا طواف کرنے

والے ان کتوبروں میں تلاش کرنے لگا جن کی میں نے تصویریں ہی دیکھی تھیں۔

میرے ساتھ کی نشست پر ایک بزرگ تشریف فرما تھے ـــــ میں اپنے آپ میں آیا تو انہوں نے مجھے اپنی طرف کھینچا۔ ان کی خاموشی نے ـــــ ویسے وہ گہری محبّت کے مالک ہوتے ہوئے بھی کم آمیز اور کم سخن تھے۔ کم سخنی جو عاشقوں کی علامت ہے۔ یہ مولانا انعام الرحیم (؟ انعام الکریم) تھے دیارِ رسولؐ میں دینِ رسولؐ کا درس دیتے ہیں، انہوں نے مجھے صرف اتنا پتہ ہی بتایا اور اپنے بارے میں کچھ بھی تو نہیں فرمایا۔ ۱۹۶۸ء میں مدینہ منوّرہ میں دوبارہ حاضری پر اُن کی میزبانی نے مجھے سرافراز فرمایا ـــــ اور اس موقع پر کسی نے بتایا کہ مولانا برس ہا برس سے دیارِ حبیبؐ میں مقیم ہیں لیکن اب تک مزار کی جالیوں تک نہیں پہنچ سکے ہیں۔ ہر دن دربارِ نبی صلی اللہ علیہ وسلم میں حاضری دیتے ہیں مگر روضہ سے قربت دل وجاں پر لرزہ طاری کر دیتا ہے ـــــ حضورؐ سے قربت انہیں گستاخی معلوم ہونے لگتی ہے اور نگاہوں سے جالیوں کا بوسہ لے کر نہ جانے کیسے اس دربار سے رخصت ہوتے ہیں (

ہم جان دے کے دل کو سنبھالے ہوئے تو ہیں

میں کبھی خاموشیوں میں اپنے ربّ سے کہتا کہ ـــــ "میرے ربّ! میں حاضر ہوں"، کبھی اپنے بیٹے عاکف کو کوئی دُعا یاد کراتا ـــ اُس وقت عاکف کی عمر آٹھ سال تھی اور کبھی مولانا انعام الرحیم سے چند باتیں کر لیتا۔

اعلان ہوا کہ ظہران آرہا ہے۔ جہاز چند ے ظہران میں ٹھہرا اور جب وہاں سے دوبارہ پرواز شروع ہوئی تو عجب نقشہ سامنے تھا۔ لوگ جہاز میں اس طرح کھڑے تھے جیسے کراچی میں بسوں میں کھڑے ہوتے ہیں۔ ریڈیو، ٹیلی وژن اور دوسرا سامان کیبن میں ان کے ساتھ تھا۔ میں نے سوچا کہ جہاز کا حشر کیا ہوگا؟ مگر خود ہی اپنے اندیشے پر ہنس پڑا ـــــ کراچی کے ہوائی اڈے پر ہی تو اس سفر کے ابدی ہونے کی تمنا دل میں اُبھری تھی ـــــ پھر اندیشہ کیا اور کیسا؟۔ کچھ دیر کے بعد خلوت نے پھر اپنی آغوش میں لے لیا۔

آخر ہوائی جہاز نے جدہ کی سرزمین کو بوسہ دیا ـــــ

خلوت کی گھڑی گزری، جلوت کی گھڑی آئی اب ہر طرف شور تھا ـــــ مسافر اپنے سامان کے لئے بے قرار تھے ـــــ کسٹم والے مسافروں سے اور مسافر کسٹم والوں سے اُلجھ رہے تھے۔ میں عاکف کے ساتھ ایک کونے میں کھڑا ہو گیا ـــــ یقین تھا کہ میری باری بھی آئے گی، اور اب پھر میں نے اپنے گرد اللّھم لبیک اللّھم لبیک کا حصار کھینچ لیا ـــــ مسافر باہر جاتے رہے، مجمع کم ہوتا رہا اور، اب میری باری آئی ـــــ دو صندوقوں میں سے ایک غائب تھا ـــــ کسٹم والے انگریزی سے نابلد ـــــ اور میں ؛ حجازی لے، کے باوجود نغمۂ ہندی کا اسیر ـــــ بابِ ارضِ حرم جدہ کے ایئر پورٹ پر بچپن اور لڑکپن میں پڑھی ہوئی عربی ذہن میں مرتب ہو کر ہونٹوں تک آنے کے لئے آمادہ ہو گئی ـــ میں نے لفظوں کے ٹکڑے جوڑے اور کسٹم والے سے کہا

"الصندوق الثانی لاموجود ـ لونہا اسود"

(دوسرا صندوق غائب ہے اور اس کا رنگ سیاہ ہے)

مجھے تو یہ بھی خیال نہ آسکا کہ یہ "غیر موجود" کا محل تھا ـ مگر میری ٹوٹی پھوٹی عربی "افہام و تفہیم" کا پُل بن گئی ـــ دنیا میں زبانیں کس تیزی کے ساتھ رنگ روپ بدلتی ہیں ـــــ چار سو سال پہلے کی دکنی کو کتنے لوگ اردو سمجھ کر قبول کریں گے ـــــ اس کو سمجھنے کے لئے خصوصی تربیت اور مطالعہ کی ضرورت ہے ـــــ چاسر کے عہد کی انگریزی کی بھی یہی صورتِ حال ہے۔ دنیا کی دوسری زبانیں بھی اسی درجہ بدلی ہیں، لیکن قرآنِ حکیم کا زندہ معجزہ یہ ہے کہ اس کتاب کی زبان نے دنیائے عرب کو لسانی اور پھر فکری طور پر متحد کر رکھا ہے ـ قرآن کی عربی آج بھی معاشرے میں "قولِ معروف" کی اساس ہے ـ ہر عرب ملک میں عربی زبان کی مقامی بولی موجود ہے مگر ان بولیوں کے بولنے والے اپنے اجتماعات میں قرآنی عربی کے ذریعہ اپنا اظہار کرتے ہیں ـ اسی کتابِ مبین نے اس عجمی کو سرزمینِ حجاز میں عجمی نہیں رہنے دیا۔

ایک دن ٹیکسی والا چلنے پر آمادہ نہ تھا ـ انتظار سے تنگ آ کر سورہ یوسف کی آیت کا سہارا لیتے ہوئے میں نے کہا،

تمشی یا صاحب السیّارہ

اور پھر ٹیکسی چل پڑی۔

کسٹم والوں نے سامان خاصی باریکی سے دیکھا۔ عاکف کے گلے میں زری گوٹے کا ایک ہار پڑا تھا، اور میرا ہار ہینڈ بیگ میں رکھا تھا۔ دونوں کو ذہب خالص سمجھا گیا۔ میں نے بتایا کہ کراچی میں اس کی قیمت تین روپے فی ہار ہے۔ جی چاہے تو رکھ لیجے'۔ یوں بات ختم ہوئی اور ہار بھی مل گئے۔ امریکہ جاکر ان ہاروں کی نمائش پاکستانی ثقافت کے نام سے کی گئی ___

کسٹم سے فارغ ہوکر باہر قدم رکھا ہی تھا کہ آواز آئی

"السلام علیکم"

"علیکم السلام" میں نے جواب دیا۔ بولے "آپ ہمارے ساتھ چلئے"۔ سلام کا رشتہ اپنی جگہ سہی، مگر دعوت سمجھ میں نہیں آئی، اور پھر کراچی میں کسی رہنے والے کی سمجھ میں کیسے آتی جہاں "کسے را باکسے کارے باشد"۔ میں حیرت سے اُن صاحب کو دیکھتا رہا۔ وہ میری کیفیت سمجھ گئے۔ کہنے لگے "میرا نام خورشید ہے۔ لاہور کا رہنے والا ہوں۔ اپنی بیوی کو لینے آیا تھا۔ وہ اس پرواز سے نہیں آئی۔ آپ کے بچے کو ساتھ دیکھا تو خیال آیا کہ آپ ہی کو ساتھ لے چلوں۔ میرا قیام مکہ معظمہ میں ہے"۔ چند جملے مکمل تعارف بن گئے۔ "السلام علیکم" ___ دو بول آج بھی دنیائے اسلام میں تعارف کا درجہ رکھتے ہیں اور تعارف بھی ایسا کہ آدمی ایک ہی خاندان کا فرد ہو جاتا ہے ___ وہ عالم گیر خاندان جسے اسلام کہتے ہیں ___ مگر آج کی دُنیا میں مزید کلمات کی ضرورت پڑتی ہے۔

میں خورشید کو دیکھتا رہا۔ آج میں خورشید کے خدوخال کو الفاظ میں پیش نہیں کر سکتا مگر مجھے یقین ہے کہ میں خورشید کو دیکھتے ہی پہچان لوں گا ___ اور پھر مشرق و مغرب میں "السلام علیکم" کے ذریعہ جو آدمی میری زندگی میں بھائی کی طرح داخل ہوا، اس نے ہمیشہ خورشید کی یاد دلائی۔ خورشید میرے لئے اسم نہیں بلکہ صفت بھی ہے۔

خورشید کو میں دیکھتا رہا

"آپ کیا دیکھ رہے ہیں؟"

"کچھ نہیں ــــ میں تمہارے خدوخال میں اپنی تاریخ کو دیکھ رہا ہوں"

"جی ــ کیا کہا؟"

"کچھ نہیں ــــ مگر خورشید!

کیا سچ مچ ہم ایسے مہمان ہیں کہ میزبان نے تمہیں ہمارے استقبال کے لئے بھیج دیا۔ آؤ چلیں"

کچھ سامان میں نے سنبھالا، کچھ خورشید نے ــ باہر ٹیکسی لی ــ خورشید اپنے کسی عزیز کے مکان پر لے گئے۔ کہنے لگے "گرمی بہت ہے ــــ غسل کر لیجئے اور پھر خانہ کعبہ کے لئے روانہ ہوں"۔ میں نے غسل کیا ــ پانی کا ہر قطرہ جو جسم کو چھوتا ہوا غسل خانے کے فرش پر گرتا، زندگی کے کسی ایسے لمحہ کی مثال معلوم ہوتا جو میری زندگی میں آیا ضرور، مگر جیسے آنا نہیں چاہیئے تھا ــــ اور جب غسل مکمل ہوا تو جیسے میرے بدن کی مٹی، ایک نئے وجود کا دیباچہ بن گئی ــــ پانی، جو حیات کا آغاز بنا۔ پانی جو خود پاک ہے اور دوسروں کو پاکیزگی عطا کرتا ہے۔ پرانے قصوں میں شہزادے آبِ حیات کی تلاش میں نکلتے تھے اور اس رات میں آبِ حیات کی سرزمین پر قدم رکھ چکا تھا ــــ ابھی آبِ حیات دور تھا، مگر یہ پانی مجھے آبِ حیات کے قابل بنا رہا تھا ــــ آبِ حیات، جو غلافِ کعبہ ہے، آبِ حیات، جو مقامِ ابراہیم پر سجدہ ہے، آبِ حیات، جو زمزم ہے، اور آبِ حیات جو گنبدِ خضریٰ پر پہلی نظر پڑنے کا نام ہے ــــ یہ نظر جو آنسوؤں سے شاداب ہوتی ہے اور یہ آنسو جو وجود کو سرسبز بنا دیتے ہیں۔

غسل کے بعد قہوے اور ہلکے کھانے سے تواضع کی گئی ــ پھر خورشید نے مکہ معظمہ کے لئے ٹیکسی لی اور اب ہم بیت اللہ کی سمت رواں تھے۔ مجھے ۱۹۳۰ء سے پہلے عموجان (والد محترم حضرت ثاقب کانپوری) اور دادی بی کے حج کی کہانیاں یاد آگئیں۔ عموجان کو شادی سے پہلے حج کی سعادت نصیب ہوئی تھی۔ یہ وہ دور تھا جب قافلے اونٹوں کی پیٹھ پر سفر کرتے تھے اور ہر میل عاشقوں کے لئے شوق کا امتحان ہوتا تھا ــــ آج راستے گاڑیوں کے پہیے تلے ریشم کے تھان کی طرح

بچھے ہوئے ہیں اور جدہ سے مکہ معظمہ کا فاصلہ ایک گھنٹہ سے کم رہ گیا ہے ــــــ زندگی کا یہ ارتقاء بھی عجب ہے کہ آج ہم فاصلوں کو میل و فرسنگ کے پیمانوں سے نہیں بلکہ وقت کے پیمانے سے ناپتے ہیں۔

مکہ معظمہ پہنچ کر خورشید نے سامان اپنے گھر رکھا ــــ وہاں اُن کے دو دوست منتظر تھے، معلوم ہوا کہ یہ دونوں پاکستانی ہر جمعرات کو جدّہ سے مکّہ آتے ہیں، خانۂ کعبہ میں نمازِ جمعہ ادا کرتے ہیں اور جمعہ کی شام واپس لوٹ جاتے ہیں۔

ہم لوگوں نے جب خانۂ کعبہ میں قدم رکھا تو آدھی رات کا ہنگام تھا، لیکن رات تو بیت اللہ میں آتی ہی نہیں ــــــ بجلی کے ہزاروں چراغ اور دلوں کے بے شمار سورج چمک رہے تھے۔ ہر طرف اُجالا تھا ــــ وہ اُجالا جو نزولِ قرآن نے اس کائنات کو عطا کیا ہے ــــ "مطلع الفجر" نزولِ قرآن کے بعد کے زمانِ مسلسل کا نام ہے۔

کیسی روشن تھی وہ رات، جب رات ہمارے ساتھ حرم کعبہ میں داخل ہوئی تا کہ حدودِ حرم میں نور کی آغوش میں سما کر اپنے آپ کو نور بنا لے۔

ایک رات ـ خانۂ کعبہ میں

ہزاروں قمقمے روشن تھے، ہزاروں دلوں کے سورج صحنِ کعبہ میں چمک رہے تھے ـــ یہ ایک نیا نظامِ شمسی ہے ـــ اور اس جلوت میں بھی رات اپنے پردوں کے ساتھ آئی، اپنے حجاباتِ عفت کے ساتھ خانۂ کعبہ میں داخل ہوئی ـــ اسلام اور خانۂ کعبہ دونوں کے لئے یہی یہ بات ہے

جو اس میں داخل ہوا اُسے

امن مل گیا۔

یہ امن ہمہ جہتی ہے ـــ جو حصارِ حرم میں آگیا اس کے لئے نہ خوف ہے اور نہ حُزن۔ خوف خارجی اندیشوں اور ماحول کے تقاضوں سے جنم لیتا ہے، اور حُزن، ذہنی اور نفسی بے چینی، انتشار، اضطراب، ناامیدی اور اندیشوں کا نام ہے۔ حرم میں پناہ لینے والے خوف اور حُزن دونوں سے بلند تر ہو جاتے ہیں ـــ یہاں تو وقت خود ابدیت کی بھیک مانگنے کے لئے آتا ہے۔ وقت، جو ہماری کسوٹی ہے، ہمارے لئے عیار ہے ـــ کعبہ تو وقت کو یہ معیار عطا کرتا ہے۔

بات ہو رہی تھی رات کی ـــ دلوں کے سورج کے اُجالے میں رات صحنِ کعبہ میں داخل ہوئی ـــ اور اِن اجالوں میں وہ نامحرموں کی نظر سے پنہاں تھی ـــ اس اُجالے میں کسی نامحرم کو رات نظر کب آتی

بھیگی ہوئی رات آبرد سے
داخل ہوئی کعبے میں وضو سے

اوڑھے ہوئے ریلیٔ گُل اندام
شبنم کی ردا بقصدِ احرام

گویا کہ نہا کے آئی فی الحال
جُھک جُھک کے نچوڑتی ہوئی بال

کیا سعیٔ صفا سے رنگ فق ہے
سر سے پا تک عرق عرق ہے

نامحرموں سے چُھپائے چہرہ
پردیں کو بنائے منہ پہ سہرہ

آنا کھلتا ہوا نہ جانا
اندازِ خرام صوفیانہ

سناٹے کا دم انیس و ہمدم
انفاسِ ہوا رفیق و محرم

خوشبو وہ کہ ہار یاسمن کے
لپٹے ہوئے بالوں میں دلہن کے

قُطبین کے سایۂ ضیا میں
مشغول دوگانے کے ادا میں

خلوت کی جمائے انجمن کو
پردے میں چھپائے ماہ من کو

صُورت میں غلافِ محترم کے
در پردہ طواف میں حرم کے

اور میں نے دیکھا کہ غلاف کعبہ میں حرکت سی تھی۔ غلاف، کعبہ کا طواف کر رہا تھا۔ یہ تو رات تھی جس نے غلاف کو اپنا پردہ بنا لیا تھا۔ انسانی آوازوں کے درمیان خاموشی کا ایک جزیرہ تھا اور رات اسی خاموشی کے جزیرے میں انفاسِ ہوا سے پیامِ دوست سُن رہی تھی۔ سنگِ اسود ازلی اور ابدی خوشبوؤں کا گہوارہ بنا ہوا تھا۔ ان خوشبوؤں میں معمارِ حرم ابراہیم علیہ السلام، ذبیح اللہ حضرت اسماعیل علیہ السلام اور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھوں کے لمس کی جاوداں خوشبو کے گرد اس ملتِ مُسلمہ کے اجتماعی نفس کی خوشبو کا دائرہ تھا۔ مشک و عنبر کو حبیب اللہ کے

برگزیدہ بندے حجرِ اسود پر ملتے ہیں، اور خوشبوؤں سے اسے غسل دیتے ہیں تو ان خوشبوؤں کے لئے جنت کے دریچے بھی کُھل جاتے ہیں ـــــ اور ان خوشبوؤں نے ایک نیا آسمان تخلیق کر دیا تھا، جس کے تلے شبنم کی ردائے حرم میں ملبوس رات دوگانہ ادا کر رہی تھی۔

یہ شبِ جمعہ تھی۔ جب میں اپنے آپ میں آیا تو خود کو طوافِ کعبہ کرتے ہوئے دیکھا طواف کی دعاؤں کی کتاب اُس رات بند رہی ـــــ میری روح جو سرمدی نغمے گا رہی تھی، وہی نغمے میری دُعا تھے ـــــ اور یہ سرمدی نغمے عبارت تھے اللہ کے اسمائے حسنیٰ اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اسمائے گرامی سے ـــــ مگر صحنِ کعبہ میں بھی ربِ کعبہ کو خدائے محمدؐ ہی کہا ـــــ یہ طواف سنتِ ابراہیمی بھی تھا اور میری زندگی کا پہلا رقصِ آزادی بھی ـــــ ہر قدم کے ساتھ ایک زنجیر ٹوٹ جاتی۔ حرمِ کعبہ کی طرف جب آ رہا تھا تو لبیک لبیک کی صدائیں میرے عزم کا اظہار تھیں، مگر وقتِ طواف جیسے لبیک لبیک کی صدائیں جیسے میرے وجود کا اعلان تھیں ـــــ جیسے میں کسی طالبِ علم کی طرح اپنی حاضری لگوا رہا تھا۔

طواف کے سات دائرے مکمل ہوئے ـــــ طواف کے سات چکر، جیسے تخلیق کے سات مراحل ہیں۔ دن تو سات ہی ہیں ـــــ یہ طواف وقت کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے۔ "وقت کو بُرا نہ کہو" ـــــ وقت جو شہادت ہے اس بات کی کہ بے شک انسان خسارے میں ہے سوائے ان کے جو ایمان لائے، جنہوں نے اعمالِ صالحہ کو اپنایا اور تواصوا بالصبر اور تواصوا بالحق کو اپنا شعار بنایا۔

طواف کے بعد سعی کی منزل آئی ـــــ صفا و مروہ کے درمیان یہ تیز قدمی ـــــ صفا اور مروہ جو اللہ کی نشانیوں میں سے ہیں۔ صفا کی بلندی سے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے آواز دی تھی "اے قریش والو!" ـــــ اور اہلِ قریش اس کوہِ ندا کی آواز پر دوڑے آئے تھے جو ان کے نزدیک امانت اور صدق کی علامت تھا ـــــ صفا کی بلندیوں سے یہ دعوت بھی ایک علامتی حیثیت رکھتی ہے ـــــ ایک طرف قریش والے تھے اور دوسری طرف وہ منظر جو قریش والوں کی نظروں سے اوجھل تھا ـــــ یہ مقام بلند ہی مقام بنا ہے ـــــ یعنی نبیؐ اس مقام پر فائز

ہوتا ہے کہ دنیا اور عقبیٰ دونوں ان کے سامنے ہوتی ہیں ــــ وہ جو کچھ دیکھتا ہے اس کی شہادت دیتا ہے اور اسی کی طرف بلاتا ہے ــ ۱۹۶۶ء میں صفا اور مروہ کا درمیانی فاصلہ مسقف ہو چکا تھا اور فرش پختہ کیا جا رہا تھا۔ فرش پر کنکر اور پتھر پڑے تھے ــ لوگ جوتیاں پہن کر یا چرمی جرابوں کے ساتھ سعی کر رہے تھے ــ میری روح لرز گئی کہ جس راستے پر سیدہ ہاجرہ بے تابانہ اور برہنہ پا دوڑ رہی تھیں اس پر میں جوتیاں استعمال کروں۔ شریعت کے آداب، جذب پر غالب آ گئے ورنہ جی تو یہی چاہتا تھا کہ اس مختصر سے راستے کے ہر ذرہ کو بوسہ دوں اور ہر کنکر کو اپنی پلکوں سے اٹھاؤں ــــ صفا اور مروہ کی بلندی کا جو تصور میرے ذہن میں تھا وہ بھی شکست سے دوچار ہوا۔ میں تو سمجھتا تھا کہ ایک بلندی سے دوسری بلندی تک پہنچنے میں اپنے شوق کی بلندی اور حوصلے کی پستی کا امتحان ہو گا۔ مگر یہ فاصلہ تو بقدرِ شوق نہ نکلا لیکن سعی کرتے کرتے جھریوں بھرے چہروں پر نظر پڑی اور ہاتھ گاڑیوں میں بیٹھے معذور لوگوں کو دیکھا کہ سعی کے لئے دوسروں کے محتاج ہیں تو اپنے خیالات پر ندامت ہوئی اور " الدین یسر" کی حقیقت سامنے آئی ــــ اللہ لوگوں کو ان کی وسعت اور گنجائش سے زیادہ مکلف نہیں کرتا ــــ اور اس اجتماعی دین میں تو ملت کے ہر فرد کا لحاظ لازم ہے ــ ہاں فرش پر بچھے ہوئے کنکروں کے حضور میں نے سلام محبت پیش کیا۔ ان کنکریوں سے پیروں میں جو چبھن پیدا ہوئی وہ دل کی خلش بن گئی۔

زمزم ہماری تاریخ کے تسلسل کی طرح رواں تھا ــــ سعی کے بعد جب زمزم کی یہ فراوانی دیکھی تو ضبط کے بندھن ٹوٹ گئے ــــ میری ماں نے زمزم میں بھگو کر اپنا کفن رکھ چھوڑا تھا ــــ وہ زمزم جس کے چند قطرے ہم بچپن سے اب تک پانی میں ملا کر قبلہ رو کھڑے ہو کر پیتے رہے تھے آج سامنے جیسے موج زن تھا۔ نلوں سے زمزم بہہ رہا تھا اور میرے جسم کو زمزم کے چھینٹوں نے گلزارِ ابراہیم کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا بنا دیا تھا۔ زمزم سے وضو بلکہ نیم غسل کر کے پھر صحنِ کعبہ میں پہنچا ــــ مقامِ ابراہیم پر اس نقشِ پا کو سجدہ کرنے کے ارادہ پر غالب آ کر خدائے برتر کے حضور سجدہ ریز ہو گیا ــــ یہ دوگانہ، لمحوں میں صدیوں کا سفر تھا ــــ اور میرا ہر لمحہ صدی در کنار تھا۔

میں اپنے بخت پر نازاں تھا کہ اس رات دیر تک کوئی مجھے مقامِ ابراہیم سے ہٹانے والا نہیں تھا ـــــ میرے آنسو پتھر کی سِل میں جذب ہوگئے اور اس نقشِ پا میں اس کی حیات کا جلوۂ ابد آثار نظر آیا جس نے ہر آجل معبود کی نفی کی تھی۔

(حضرت) ابراہیمؑ جسے اس کے رب نے ایک ملّت کہا ہے ـــ استوار اور مستقیم ملّت۔

رات آہستہ آہستہ صبح کی طرف بڑھ رہی تھی ـــــ وقت کی صراحی سے لمحات قطرہ قطرہ ٹپک رہے تھے ـــ ان کیفیات سے اُبھر کر میں نے اب بیت الحرام کی طرف نگاہوں سے سفر کرنا شروع کیا ـــــ روشنیاں دُور تک ـــــ حدِّ نظر تک ـــــ یوں محسوس ہوا کہ ساری دنیا صحنِ بیت اللہ میں سمٹ آئی ہے اور اس کی روشنیاں اس دنیا کو روشنی کی کرنوں میں نہلا رہی ہیں ـــ آپ بیت اللہ میں جس طرف بھی سجدہ کریں رُخ درست رہے گا ـــ ہر طرف کعبہ۔ ایسے عالم میں نظر نے یہ بھی دیکھا کہ بعض لوگ یوں سو رہے ہیں کہ ان کے پیر کعبہ کی طرف ہیں۔ یہ عظیم میں مکان کی تعمیر سے قبر کی کھدائی تک سمتِ قبلہ ایک اشارہ ہے، اور یہاں صحنِ بیت الحرام میں اس شب بعض سونے والے اس احساس سے بے خبر تھے ـــــ کبھی جادۂ صد سالہ، ایک آہ میں طے ہو جاتا ہے اور کبھی ایک لحظہ کی غفلت منزل سے صدیوں دور پہنچا دیتی ہے۔

رات اب صبح کے دامن کو چھُونے والی تھی کہ میں نے تلاوت شروع کردی ـــــ وہ الفاظ یاد آئے جو اقبالؒ کے والد نے اُن سے کہے تھے کہ "تلاوتِ کلامِ پاک یوں کرو جیسے یہ کتاب تم پر نازل ہو رہی ہو"۔ اور اس کا نسخہ یہ بتایا تھا کہ اپنے آپ کو محمدِ عربی صلی اللہ علیہ وسلم کے رنگ میں جتنا رنگو گے اتنا ہی قرآن تمہارے نفس پر نازل ہوگا۔ اس رات صحنِ کعبہ میں تلاوت کرتے ہوئے میرا وجود اس حقیقت کی صداقت پر گواہی دے رہا تھا کہ ؎

ترے ضمیر پہ جب تک نہ ہو نزولِ کتاب
گرہ کشا ہے نہ رازیؔ، نہ صاحبِ کشّاف

اور اس رات آٹھ سالہ عاکف کی آنکھوں میں نیند کے طائر نے شب بسری نہیں کی ـــ

عاکف کے ذوق و شوق کو دیکھ کر دل کی گہرائیوں سے اس کے لئے دعا نکلی۔ مدتوں عاکف کی یہ کیفیت رہی کہ اگر رات کو عشاء کی نماز پڑھے بغیر سو جاتا تو کسی وقت گھبرا کر اٹھتا اور کہتا۔ "ابّو نماز پڑھ لوں؟" یہ کیفیت ۱۹۷۳ء تک جاپان کے قیام کے دوران تک رہی۔۔۔۔ آج عاکف جب نماز پڑھے بغیر سو جاتا ہے تو مجھے حرم کعبہ کی وہ رات شدت سے یاد آتی ہے اور میں آہستہ سے سوتے ہوئے عاکف سے کہتا ہوں "دوست! تم کہاں ہو، اپنے آپ کو ڈھونڈ لاؤ"۔ آج یہ بات اس یقین کے ساتھ تحریر کر رہا ہوں کہ عاکف ان سطروں کو پڑھنے کے بعد نہ اپنے آپ سے شرمندہ ہوگا اور نہ مجھے شرمندہ کرے گا۔

اور جب رات خانہ کعبہ سے دبے پاؤں باندازِ صوفیانہ رخصت ہوئی اور سپیدۂ سحری آغوشِ ظلمت سے بیدار ہوا تو صبح کی اذان بیت اللہ میں گونجنے لگی۔۔۔۔ صبح کس طرح آہستہ آہستہ آتی ہے؟ اور اپنے آنے سے پہلے الفس و آفاق میں کیسے تبدیلیاں پیدا کرتی ہے، آسمان کے منظر اور مشرقی افق سے لے کر دل کی آرزوؤں کے جہانوں تک۔۔۔۔ اس کا اندازہ اس صبح ہو سکا۔۔۔ "الصلوٰۃ خیرٌ من النوم" کے کلمات کے ابھرنے سے پہلے ذہن میں ایک ہی خیال اپنے دائرے بنا رہا تھا کہ محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم اس کائنات کی اذانِ صبح اور نمازِ صبح ہیں۔ ؏

تو صلوٰۃ صبح تو بانگِ اذاں

اور جب اذان "لا الہ الا اللہ" کے اختتامی حصے تک پہنچی تو میں نے شبستانِ وجود کی لرزشوں کو خانہ کعبہ میں، اور اپنے وجود میں محسوس کیا۔۔۔۔ میرا وجود جو اس ساعت دنیا کی سب سے حساس رصدگاہ بن گیا تھا۔

وہ سحر جو کبھی فردا ہے کبھی ہے امروز
نہیں معلوم کہ ہوتی ہے کہاں سے پیدا
وہ سحر جس سے لرزتا ہے شبستانِ وجود
ہوتی ہے بندۂ مومن کی اذاں سے پیدا

اور مجھے یہ خیال بھی آیا کہ یہ سحر تو کائنات کے مطلع پر چودہ سو سال سے اپنے آثار لیے قائم ہے ـــــ وہ جو مسلمِ اول تھا، وہ جو معبود کی طرف سب سے زندہ اور بیدار اشارہ ہے، اس کی لائی ہوئی سحر کو تو ہمارے اعمال، ہمارے پراگندہ افکار بھی نہیں دھندلا سکے ـــــ مگر یہ کیسی بدبختی ہے کہ جو سحر اب ملتِ مسلمہ کی مشترکہ میراث ہے اس کی طرف اس ملت کی نظریں نہیں۔

بیت اللہ میں نمازِ فجر کی ادائیگی کے بعد ہم، خورشید کے ساتھ لوٹے اور اُن کے گھر میں پڑے ہوئے نرم گدوں کی آغوش میں سما گئے ـــــ جسم اپنا حق مانگ رہا تھا۔ رُوح کبوترِ بامِ حرم کی طرح نئی بلندیوں پر طواف کرتی رہی ـــــ اور جب آنکھ کھلی تو دیکھا کہ خورشید سپر دبا رہے ہیں ـــــ یہ اُٹھانے کا انداز تھا۔ دوپہر کا کھانا وہ تیار کر چکے تھے اور اب ذکرِ الٰہی کی طرف جلدی کرنے کا وقت آ رہا تھا ـــــ جمعہ کی نماز کا وقت دور نہ تھا۔

مکّہ کے جلوہ زار میں

خانۂ کعبہ میں جمعہ کی نماز کے لئے دُنیا کے ہر گوشہ کے اہلِ ایمان جمع تھے۔ اس وادیٔ غیر ذی زرع میں، جہاں خلیل اللہؑ نے اپنے بیٹے اور بیوی کو، اپنے رب کے سہارے چھوڑا تھا ایمان کی سدا بہار کھیتی ہر طرف لہلہاتی دکھائی دیتی ہے ـــــ دنیا کے ہر حصّے کے پھل، میوے اور اشیاء ضرورت کے انبار لگے ہیں ـــــ اِس سے قطع نظر ہر قومیت کو ملتِ اسلام میں ضم ہوتے دیکھ کر میرے ذہن میں یہی تصور ابھرا کہ یہ حقیقی کھیتی ہے ـــــ جمعہ کے ازدحام میں مختلف قوموں کے لباسوں اور خدوخال کے ساتھ مختلف ذوق رکھنے والوں کے لباسوں پر لگی ہوئی خوشبوئیں، فضا میں خوشبو کا ایسا سمندر تخلیق کر رہی تھیں کہ ہر خوشبو اس سمندر کی ایک موج تھی ـــــ وہ سمندر جس کی لہریں وقت کے ساحل کے ساتھ ٹکراتی ہیں اور جس کا نام اسلام ہے۔ صحنِ کعبہ سے نظریں اگر باہر نکلیں بھی تو مکّہ کی پہاڑیاں کعبہ کی حدود میں شامل نظر آتی ہیں ـــــ اور ان پہاڑیوں کے پرے یہ آفاق اپنے آپ کو سمیٹ لیتے ہیں اور یوں لگتا ہے جیسے ساری دنیا حرمِ کعبہ میں سمٹ

آئی ہو — عمّو جان کا شعر ذہن میں گونجا ؎

مکّہ کے جلوہ زار میں عالم فضا کا ہے
ہے پاسباں جلال کہ یہ گھر خدا کا ہے

کل رات تو بیت اللہ میرے حواس کے ذریعہ میرے وجود پر چھا گیا تھا — کل رات میں نے اپنے بیٹے کو بھی تین چار بار چند لمحوں کے لئے دیکھا ہوگا — ہاں بیت اللہ کی طرف پھیلے ہوئے پیر مجھے اسی عالمِ کثیف میں کھینچ لائے تھے۔ آج (۹ ستمبر) میں جمعہ کے اس اجتماع میں یوں شریک تھا کہ اجتماع کا حصّہ تھا۔ کل کی خود فراموشی کے بعد آج کی یہ بیداری — میرے دین کا ایک اور پہلو ہے۔ جمعہ کا خطبہ شروع ہونے سے پہلے میں مسلمانوں کے اس مرکزِ مشہود کی اہمیت پر غور کر رہا تھا — یہی وہ مرکز ہے جس کا نام بچپن سے قومی ترانہ کے بولوں میں سما کر ہمارے لبوں تک آتا تھا ؎

دنیا کے بُت کدوں میں پہلا وہ گھر خدا کا
ہم پاسباں ہیں اُس کے وہ پاسباں ہمارا

اور

ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لئے
نیل کے ساحل سے لے کر تا بخاکِ کاشغر

میں سوچنے لگا کہ "حرم" تو اسلام کا اشارہ بن گیا ہے! اور آج صورتِ حال یہ ہے کہ حرم ہماری حفاظت کر رہا ہے۔ یہی وہ علامت ہے جو ہمیں بکھرنے نہیں دیتی۔ یہ ہماری آفاقیت کا اشارہ ہے۔

نمازِ جمعہ کی ادائیگی کے بعد میں نے طواف کے لئے صحنِ کعبہ کا رُخ کیا۔ سُورج کی بے مہر کرنیں انی کی طرح فرشِ زمین پر گڑی جا رہی تھیں۔ بیشتر لوگ پا تابوں، موٹی جرابوں اور جوتیوں کے ساتھ طواف کر رہے تھے — میں نے برہنہ پا صحنِ حرم میں قدم رکھا — پہلا اور فوری

ردِ عمل یہ ہوا کہ لوٹ چلو ــــ شام کو سورج ڈھلے طواف کر لینا ــــ لیکن اسی لمحے جیسے سیّدی بلال رضی اللہ عنہ نظروں کے سامنے آ گئے۔ پیٹھ کے نیچے جلتی ہوئی ریت ہے اور سینہ کے اوپر گرم پتھر کا بوجھ ہے اور حلقۂ گردن میں رسن طوقِ شہادت بنی جلوہ گر ہے ــــ عجیب بات ہے کہ بیت اللہ میں پہلی اذان سن کر حضرت بلالؓ کا خیال نہیں آیا تھا، لیکن اس لمحے وہ خود مجسم میرے سامنے آ گئے ــــ اور پھر میں طواف کرنے والوں کے ہجوم میں شامل تھا ــــ نواحِ صحرائے عشق میں ایک اور برہنہ پا جادۂ بلالؓ پر گامزن تھا ــــ بڑی آہستہ گامی کے ساتھ میں نے طواف مکمل کیا اور جب زمزم پر قدم رکھا تو چھن کی آواز آئی اور تلوے آبلوں کے امانت دار بن گئے ــــ مجھے طوافِ عشق کا صلہ مل گیا۔ یہ آبلے میرے لئے کسی کی سند تھے۔ تین مہینے تک یہ نشانِ عشق، یہ سرمایۂ جنوں میرے ساتھ رہا۔ جب نیویارک میں دسمبر، جنوری میں یہ آبلے پھوٹنے اور ختم ہونے لگے تو یوں محسوس ہوا کہ میں تہی دامن ہوتا جا رہا ہوں ــــ میری دولت مجھ سے چھن رہی ہے ــــ میں اپنے سجدوں میں اپنی روح کیلئے آبلہ صفتی اور اپنے لئے آبلہ پائی کی دُعائیں مانگتا، مگر وہ کیفیت آج تک نصیب نہ ہوئی۔

حرم شریف سے میں اور عاکف، خورشید اور ان کے دو، دوستوں کے ساتھ باہر نکلے۔ مولدِ مصطفوی صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کی ــــ یہی وہ ٹکڑا ہے جس نے زمین کو ہمدوشِ فلک بلکہ غیرتِ دہِ آسمان بنا دیا ہے ــــ دل میں تمنا پیدا ہوئی کہ کاش یہاں کوئی "مکتب"، کوئی دفتر نہ ہوتا ــــ مگر خیال آیا کہ عشقِ رسولؐ عجب مئے مرد افگن ہے ــــ اور ویسے بھی آدمی دیدۂ صدیقؓ سے دیکھے تو ؎

از خدا محبوب تر گردد نبیؐ

ایسی صورت میں دیوانوں پر قدغن لازم ہے۔

ٹیکسی لے کر میں مکّہ کے نواح میں اپنی نشانیوں کی تلاش میں نکلا ــــ میں، جو ایک فرد بھی ہوں، ایک قوم بھی اور ایک ثقافت بھی۔ میری جڑیں موئن جوڈارو میں نہیں بلکہ

حرمِ کعبہ، غارِ حرا، خاکِ بدر، جادۂ مدینہ اور روضۂ نبویؐ میں پیوست ہیں۔ انسان ہونے کے ناتے نیل سے لے کر چین اور سندھ کی تہذیب، سب سے مجھے دلچسپی ہے ـــــ لیکن یہ مقامات میری پہچان نہیں۔

جبلِ نور کا سلسلہ شروع ہوا۔ خورشید نے بتایا، وہ ہے غارِ حرا ـــــ اور اس غار کو نمایاں کرنے کے لئے سفید رنگ موجود تھا ـــــ نہ بھی ہوتا تو میرا دل اسے خود دریافت کر لیتا۔ کتنے ہی لوگ غارِ حرا کی طرف رواں دواں تھے ـــــ یہ لوگ خلوت گاہِ مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم میں جا کر نفل ادا کرتے ہیں ـــــ ایک کے بعد ایک۔ یہی وہ چھوٹا سا غار تھا جس کی تنہائیوں کو ربِّ ذوالجلال نے وحیٔ الٰہی کو برداشت کرنے کے لئے حضورِ اکرمؐ کی تربیت گاہ بنایا تھا۔ اسی غار کی تاریکیوں سے رُشد وہدایت کا وہ سورج طلوع ہوا، جس کی تقدیر کبھی غروب نہ ہونا ہے۔ لوگ غارِ حرا کی طرف رواں دواں تھے، لیکن میں قدم نہ اٹھا سکا۔ انسان بھی کیسے متضاد عناصر سے تخلیق کیا گیا ہے۔ کبھی کسی کے نقوشِ قدم کو چومنے کی آرزو، معراجِ حیات معلوم ہوتی ہے اور کبھی ان نقوشِ قدم کی طرف بڑھنا بارِ امانت ـــــ وہ جسے پہاڑ بھی نہ اٹھا سکیں ـــــ میں لرز گیا۔ میں اس غار میں قدم کیسے رکھ سکتا ہوں ـــــ وہ غار جس میں کائنات کے اسرار اپنی گرہیں، محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کے حضور کھولتے تھے۔ وہ غار جو محمدؐ کے انفاس کی دولت بیدار اپنے سینے میں چھپائے، دلِ حیات کی طرح دھڑک رہا ہے۔ وہ غار جسے قلبِ محمدیؐ کے بعد اللہ کے آخری سلسلۂ وحی کی پہلی کڑی کو برداشت کرنے کی طاقت عطا ہوئی ـــــ میرے ماتھے پر پسینہ پھوٹ بہا۔ روایت کے مطابق بسا اوقات جب حضرت ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی نازل ہوتی تو اس کے بوجھ تلے وہ اونٹنی زمین پر قدم ٹیک دیتی جس پر آپ سوار ہوتے، مجھ میں تو اتنا حوصلہ اور ظرف بھی نہیں تھا جو حضورؐ کی اونٹنی میں تھا ـــــ میں غارِ حرا میں قدم کیسے رکھتا۔

اور اب میں اس میدان میں تھا جہاں نبیٔ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع کا خطبہ ارشاد فرمایا تھا ـــــ چاروں طرف وسعتیں ہی وسعتیں ـــــ اور پھر اس وسعت میں وہ آواز

گونجنے لگی جو گوشِ سماعتِ آدم کا آویزہ ہے۔

"لوگو! جہالت کے تمام دستور میرے
قدموں تلے ہیں۔"

اور میں بیداری کے عالم میں انسانیت کا سب سے اہم منشور سن رہا تھا ـــــ وہ منشور جس نے نسل و رنگ کے تمام امتیازات کی جڑ کاٹ دی ـــــ وہ منشور جو عالم گیریت نہیں بلکہ آفاقیت کی ضمانت اور اساس ہے۔ وہ منشور جس نے اقوام کی جمعیت قائم نہیں کی بلکہ انسانیت کو وحدت اور تکریم عطا کی ہے

مکّہ نے دیا خاکِ جنیوا کو یہ پیغام
"جمعیتِ اقوام کہ جمعیتِ آدم؟"

حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کو خواب میں دیکھنا میری زندگی کی عزیز ترین آرزو ہے مگر شاید میری آنکھیں خواب کی وادی میں بھی جمالِ مصطفویؐ کی امانت کو برداشت نہیں کر سکتیں ـــــ ایک بار خواب میں حضور صلی اللہ علیہ وسلّم اور صدیقِ اکبرؓ کی آوازیں سنی تھیں ـــــ میں نے خواب میں دیکھا کہ میں کسی جگہ کھڑا ہوں اور سامنے ایک خوبصورت حجاب (پارٹیشن ہے)۔ اس کے پیچھے سرورِ کائنات اور صدیقِ اکبرؓ محوِ گفتگو ہیں اور یہ گفتگو میں سن رہا ہوں ـــــ اگر یہ حجاب خوبصورت نہ ہوتا تو میں اسے اپنے اعمالِ قبیحہ کی علامت سمجھتا۔ اور اس خواب کے بعد، مکّہ کے نواح میں، اس میدان کی وسعتوں میں، میں نے عالمِ بیداری میں وہ آواز سُنی ـــــ آواز تو ویسے بھی فنا نہیں ہوتی ـــــ پھر یہ آواز تو اُس کی تھی جس کی ذات "فنا کے دشت میں" "روضۂ بقا" ہے۔

واپسی پر حرم شریف کے قریب ہی محلّہ جیاد میں ڈاکٹر ولی صاحب کی صاحبزادی ڈاکٹر ہاشمہ سے ملنے گیا۔ ولی صاحب اُن دنوں شعبۂ حیاتی کیمیا جامعۂ کراچی کے صدر تھے۔ ولایت

ان کے نام ہی کا حصّہ نہیں بلکہ ذات کا حصّہ بھی ہے۔ اس سفر پر نکلتے وقت میں نے اسٹیٹ بینک سے دو سو ڈالر قرض لئے تھے، اس شرط پر کہ ڈالر ہی واپس کئے جائیں گے۔ مجھے تو تنخواہ کا کوئی حصّہ غیر ملکی زرِ مبادلہ میں ماہانہ لینے کی اجازت بھی نہیں ملی تھی، حالانکہ میرا بچّہ میرے ساتھ گیا تھا۔ خیر چھوڑیئے اس وقت دنیا کی باتیں ـــــ میں نے ولی صاحب سے عرض کیا تھا کہ وہ مجھے اپنی صاحبزادی کے نام رقعہ لکھ دیں تاکہ حسبِ ضرورت سعودی ریال اُن سے لے سکوں اور پاکستانی سکہ میں واپس کر سکوں۔ ڈاکٹر ہاشمہ اور اُن کے شوہر سے ملاقات ہوئی۔ مجھے یاد بھی نہیں کہ میں نے اُن سے کتنی رقم لی تھی مگر ان کی ایک بات اچھی طرح یاد ہے ـــ یوں جیسے آج کی بات ہو ـــ گذشتہ گیارہ برسوں کے ہر لمحہ میں یہ بات حرفِ تازہ محسوس ہوتی رہی ہے۔ میں نے ڈاکٹر ہاشمہ سے کہا کہ "میں کل (یا آج؟ یاد نہیں رہا) ہوائی جہاز سے مدینہ منوّرہ جا رہا ہوں" ـــــ ڈاکٹر ہاشمہ کے چہرے پر کرب کی ایک لکیر دوڑ گئی اور انہوں نے بڑے گھائل لہجے میں کہا "کتنی بھائی آپ اس راستے پر سے ہوائی جہاز میں گزر جائیں گے جو حضورؐ نے پاپیادہ اور اونٹنی پر طے کیا تھا۔ وہ راستہ جو ہجرت کا راستہ ہے"۔ میں بونے کی طرح سکڑتا گیا اور ہاشمہ کا قد و قامت ایک مومنہ کی عظمت کا پیمانہ بن کر بڑھتا گیا ـــــ شاید میں نے اسلام کے بارے میں ہاشمہ سے زیادہ پڑھا ہوگا ـــ مگر علم، عشق کے سامنے کتنا حقیر ہے! لیکن عشق بھی تو علم کی ایک اور صورت ہے۔ علم نورانی ـ یہ وجدان ہے جو اشیاء کو مکمل طور پر اپنی گرفت میں لے لیتا ہے اور عقل تجزیہ کرتی رہ جاتی ہے۔

ڈاکٹر ہاشمہ کے فلیٹ ہی میں خانۂ کعبہ میں مغرب کی اذان کا آغاز سنا "اللہ اکبر" اور پھر ہم سب حرم شریف کی طرف روانہ ہو گئے۔ شام کے چراغ روشن ہو چکے تھے ـــ ان چراغوں میں آج اپنی منزلوں کے نشان نظر آ رہے تھے ـــ ہر برقی قمقمہ جیسے ایک دعوت تھا "چلو سوئے کعبہ چلو"ـــ ایک بھولا بسرا مصرع یاد آیا ؎

ہم نے ستارے تراشے ہیں چراغِ شام سے

اور آخر ارضِ حرم سے رخصت کی گھڑی آئی۔ میرے بڑے سوٹ کیس کا ہینڈل ٹوٹ گیا

تھا۔ خورشید اور اُن کے دوستوں نے نہایت مضبوطی کے ساتھ چمڑے کا ایک ٹکڑا لگایا ـــــ اور اس طرح کہ اس سوٹ کیس نے نیویارک تک کہیں دھوکہ نہ دیا۔

رات کو بنجو (دین) سے روانہ ہوئے۔ میں نے دو کی جگہ تین نشستیں لے لی تھیں تاکہ عاکف آرام کر سکے۔

سفر کے وقت کے تعین میں یہ لحاظ رکھا گیا کہ ہم مدینۃ الرسولؐ میں اس وقت پہنچیں جب صبح صادق مطلع پر اپنا جلوہ اولیں دکھائے ـــــ اور زندگی کے لمحات میں وہ صبح جاوداں ہو جائے جس میں نظر گنبد خضریٰ پر پڑے۔

.......لیکن قرآنِ حکیم کا زندہ معجزہ یہ ہے کہ اس کتاب کی زبان نے دنیائے عرب کو لسانی اور پھر فکری طور پر متحد کر رکھا ہے۔ قرآن کی عربی آج بھی معاشرے میں "قولِ معروف" کی اساس ہے۔ ہر عرب ملک میں عربی زبان کی مقامی بولی موجود ہے مگر ان بولیوں کے بولنے والے اپنے اجتماعات میں قرآنی عربی کے ذریعے اپنا اظہار کرتے ہیں۔ اسی کتابِ مبین نے اس عجمی کو سرزمینِ حجاز میں عجمی نہیں رہنے دیا۔

اے خنک شہرے کہ آں جا دلبر است

نجم سحر آسمان پر چمک رہا تھا، ستاروں کی چمک، دل کا اُجالا، افق پہ صبح کے آثار — ان میں کوئی کشمکش نہ تھی —— یہ سب روشنیاں ایک ہو گئی تھیں —— رات کی ظلمت سیماب پا ہو چکی تھی اور آسماں سحر کے نور سے آئینہ پاش ہو چکا تھا اس وقت گنبدِ خضریٰ نظر کے سامنے چمکا —— ہرے رنگ میں سارے رنگ اور سارے منظر جاگتے اور سوتے ہوئے —— کتنے ہی ایسے منظر اور رنگ تخلیقِ مسلسل کے سانچے میں پگھلتے ہوئے جن کا کوئی نام دنیا کی کسی زبان میں نہیں۔ گنبدِ خضریٰ کی آغوش میں ایسا نور کہ قلبِ مسلماں جس کا ایک عکس ہے۔ آسماں پر نجمِ سحر، مدینہ کی گلیوں میں وہ نسیم رقصاں کہ جس میں انفاسِ عشاق کی خوشبو، رنگ بن کر دکھائی دے رہی تھی —— اور دل کی زمین میں آرزو کے پودے میں تمنا کے پھول کھلتے ہوئے —— میں اپنی ذات کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ میں نے آسمان کو جھک کر گنبدِ خضریٰ کا بوسہ لیتے دیکھا۔ میں، جو عالمِ اصغر ہوں —— میں، جس کی نظر دلِ وجود کو چیر کر ماضی کو مستقبل کا ہمسایہ بنا دیتی ہے —— مگر میں، یہ سب کچھ ہوتے ہوئے

اظہار پر قدرت نہیں رکھتا، خاص طور پر جب ذکر انؐ کا ہو جو میری پہچان ہیں ــــــ میں لفظ بار کر دلوں اور ذہنوں کو فتح کرتا رہا ہوں۔ میں نے الفاظ کی مسیحا نفسی دیکھی ہے جو گزرے ہوئے لمحوں کو بھی زندہ کر جاتے ہیں ــــــ لیکن یہ الفاظ اس منظر کی تاب نہیں لا سکتے ــــــ مگر میرا یہ گونگا سا شعر آپ سُن ہی لیں۔ یہ مجھے صرف اسی لئے عزیز ہے کہ جب دید کا غنچہ چٹکا تھا تو ہونٹوں پر اس کی مہک اس شعر کے قالب میں ڈھل گئی ؎

افلاک کو جُھکتے ہوئے دیکھا ہے نظر نے
ہے خواب گہِ شاہِ مدینہ مرے آگے

کراچی میں یوسف عباس ہاشمی صاحب نے خندق بہا الدین کا نام بتایا تھا ــ یہ ہوٹل مسجدِ نبویؐ سے ملا ہوا ہے۔ ہوٹل میں سامان رکھا اور وضو کر کے نیچے اترا تو اپنے آپ کو مسجدِ نبویؐ کے روبرو پایا۔ اب میں آئینے کے سامنے کھڑا تھا اور اس آئینے میں میرے مقابل تمام داغِ عیوب برہنگی تھے۔ اپنی زندگی کی ہر شکن میرے سامنے تھی۔ میری نگاہیں جُھک گئیں۔ ہمت کر کے پھر نگاہیں آئینے کی سمت اٹھائیں ــــــ اس آئینے میں میرے سارے داغ موجود تھے اور داغوں کے درمیان میرا دل تھا ــ سیاہ ــ ہوسِ لالہ رُخاں سے داغ داغ ــ مگر اِن داغوں کے درمیان ایک روشن نقطہ تھا ــ دیکھتے دیکھتے یہ نقطہ بڑھتا گیا ــ روشن تر ہوتا گیا ــ داغ مدھم پڑ گئے اور مجھے خود بخود معلوم ہو گیا کہ یہ عشقِ محمدیؐ کا وہ نقش ہے جو ہر مسلمان کی طرح میرے دل میں موجود ہے اور جسے مسجدِ نبویؐ کے آئینے نے مہر صفت بنا دیا۔ اور آئینے نے مہر صفت دل بلکہ مہرِ درخشاں کو اپنی آغوش میں لے لیا۔

اور پھر میں نے اپنے آپ کو مسجدِ نبویؐ کے صحن میں پایا ــــــ میں جو آدابِ عشق سے ناواقف تھا، اور جس نے یا محمدؐ کے نعرے لگائے تھے اور اس نام کے ساتھ جب کبھی گریہ گلوگیر ہوا تھا تو میں نے ہمیشہ اپنی چیخیں ہی سنی تھیں، اس صبح اس بارگاہ میں جنید و بایزید کی روایات کا امین تھا۔

ادب گاہیست زیرِ آسماں از عرش نازک تر
نفس گم کردہ می آید جنید و بایزید ایں جا

میں گواہی دیتا ہوں کہ یہ شاعری نہیں ہے بلکہ ایسی سچائی ہے جسے سب ہی مان لیں جیسے یہ سچائی کہ اسمِ محمدؐ کے بغیر عہدِ حاضر ایک خرابہ ہے، جیسے یہ بات کہ آدمی جنم جنم سے بہت پیاسا ہے، جیسے دو اور دو چار ہوتے ہیں۔

نمازِ صبح سے فارغ ہو کر میں نے روضۂ رسولؐ کی طرف اپنے قدم بڑھائے مگر میرے بیتے ہوئے شب و روز نے میرے قدم جکڑ لئے ـــــ میں "روضۃ من ریاض الجنۃ" میں داخل ہوا اور میں نے تارِ نظر کو آنسوؤں کے موتیوں سے صاف کر کے تلاوت شروع کر دی ـــــ قرآنِ حکیم میں وہ مقام سامنے آیا جس میں حضورؐ کے رؤف الرحیم ہونے کا ذکر ہے ـــــ اور یوں صدیاں پل بھر میں سامنے سے گزر گئیں ـــــ اور ہر صدی اس کے رؤف الرحیم ہونے کی گواہی تھی ـــــ یہ وہ ذات ہے جو کفار کے غم میں اپنے آپ کو ہلکان کرتی ـــــ یہ حضورؐ کی محفل ہے اور اس چاند کے گرد ستاروں کا حلقہ ہے اور کوئی اجنبی آتا ہے تو پوچھتا ہے کہ "تم میں سے محمدؐ کون ہیں"۔ میں ریاض الجنۃ سے باہر نکلا اور اب میں روضۂ رسولؐ کی طرف خود نہیں بڑھ رہا تھا بلکہ میرے کاندھے پر ایک ہاتھ تھا۔ ایک ہاتھ جو اس پوری کائنات پر آسمان کی طرح سایہ فگن ہے۔

اور اب میں مرقدِ ختم المرتبت صلی اللہ علیہ وسلم کے سرہانے کھڑا تھا۔ ایک طرف صدیقِ اکبرؓ سو رہے تھے ـــــ صدیقِ اکبرؓ گواہی دینے والے مردوں میں سب سے پہلے، غار میں دوسرے، میدانِ بدر میں چراغِ نبوت کے لئے دامانِ حفاظت (باذنِ ربّ) اور اب ابدی خواب گاہ میں شریک ہے

ہمت او کشتِ ملت را چو ابر
ثانیِ اسلام و غار و بدر و قبر

اور اس پر اضافہ کیجئے ثانیِ حشر کا ـــــ دوسری طرف فاروقِ معظم دامانِ رسولؐ میں محوِ خواب ہیں۔

مکّہ معظمہ میں مجھے یہ بات بہت THRILLING معلوم ہوئی تھی کہ مغرب کے وقت جب حرمین کے موذن اللہ اور اس کے رسول کی توحید و رسالت کی گواہی دیتے ہیں تو لوگ وقت کو ناپتے ہیں اور اپنی گھڑیاں ملاتے ہیں۔ کراچی سے روانہ ہونے سے پہلے برادرم خورشید احمد نے مجھے سیارہ ڈائجسٹ کے قرآن نمبر کے ایڈیٹروں میں شامل کر کے ایک سعادت میں شریک بنادیا تھا۔ کئی مضامین پر نظرِ ثانی اور معیار سازی کا کام میں کر چکا تھا لیکن خود مجھے دو مضامین لکھنے تھے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام اور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیّبہ پر قرآنِ حکیم کی روشنی میں مضامین حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مسلمان کا رشتہ ایسا ہے کہ صرف خاموشی کسی قدر اُسے سہارا دے سکتی ہے اور آنکھیں آنسوؤں کے وضو کے ذریعہ کسی حد تک اس کا اظہار کر سکتی ہیں۔ میں ہزار کوششوں کے باوجود کراچی میں حضور سرورِ کونین علیہ الصلوٰۃ والسلام کے بارے میں ایک سطر نہیں لکھ سکا تھا۔ مجھے کیا خبر تھی کہ مجھے وہ اس تحریر کے آغاز کے لئے اپنے دروازے پر بُلا کر میرے عشق کو اعتبار کی سند عطا کر دیں گے۔

پہلے دن نمازِ فجر کے بعد روضۂ مبارک پر جو کچھ بیتی وہ مجھے یاد نہیں، اور اگر یاد بھی ہے تو اس کا تعلق حرف و بیان کی دُنیا سے نہیں۔ سامنا کس کا تھا؟ وہ جو قرآن کے حروفِ مقطعات کے نقاب میں چھُپ کر بھی کس قدر نمایاں ہے۔ وہ جو اوّل بھی ہے اور آخر بھی۔ وہ جو وقت کا عیار ہے اور ازل سے ابد تک سارا مرحلہ اس کے لئے ایک سانس کی مسافت ہے۔

ظہر کے بعد میں پھر سلام کرنے حاضر ہوا —— صدیق اکبرؓ سے عرض کیا کہ اپنے صدق کا کردار صدقہ اپنے رب سے کہہ کر مجھے عطا کر دیجئے تاکہ میں زباں کھولوں —— اور پھر میں نے حضورِ رحمت اپنی نظم پیش کی۔

نبی محتشم! تیرا گدائے بے نوا کشفی
بچشمِ نم ترے دامن کا سایا ڈھونڈنے آیا

اور پھر اس کے حضور اپنا ایک ایک گناہ یاد آیا۔

ادھر میں ہوں کہ اکثر جسم کے جھوٹے تقاضوں پر
حدودِ شرع کو توڑا
کبھی اپنی ہوس کو بیکہ شعر و سخن دے کر
متاعِ عمرِ ضائع کی
تری توصیف ہے عمرِ پشیماں کی نئی منزل

اور یوں ہی بے آواز، لب ہلائے بغیر دو تین سو مصرعے میں نے نذرانہ کے طور پر پیش کئے ـــــ نظم کے 'شاعرانہ مرتبہ' بلکہ 'فرومایگی' کو شاید مجھ سے بہتر کوئی نہیں جانتا ـــــ مگر اُن لمحوں نے اس نظم کو میرا استغاثہ بنا دیا ـــــ مصر کے بازار میں ایک بڑھیا سوت کی انٹی لے کر یوسفؑ کی خریداری کے لئے نکلی تھی۔ مگر میں نے تو ان لفظوں سے اپنے لئے طوقِ غلامی تیار کیا تھا ـــــ یہ لفظ نہیں ہیں بلکہ غلامی کا پٹا ہیں ـــــ وہ پٹا جو کوئے محمدؐ کے اس دربان کے گلے میں میثاقِ ازلی کی طرح چمک رہا ہے، جس کا نام ابوالخیر ہے ـــــ مگر اُس گھڑی میرا کوئی نام نہیں تھا ـــــ میں تو بس اُس کوچے کی مٹی کا ایک ذرہ تھا ـــــ وہ ذرہ جو جوہر ہے ـــــ وہ جوہر جو اس آفاق کے پردوں سے گزر سکتا ہے۔

عصر کی نماز کا دامن نمازِ ظہر سے بندھ گیا ـــــ یہ پوری مدت حرمِ مصطفٰیؐ میں گزری ـــــ گرمی کی وجہ سے جب دُرّہ باز سپاہیوں کو نیند آئی تو میرے لب روضہ کی جالیوں پر تھے ـــــ میری آنکھیں بند تھیں اور ان بند آنکھوں پر آنسوؤں کی جھالروں کے پیچھے زمان و مکاں، یہ اور وہ سب دم بخود کھڑے تھے ـــــ صدیاں گزر گئیں اور حرمِ مصطفٰے صلی اللہ علیہ وسلم کی خاموشیوں کو، کوئی آواز مجروح کرنے کی جرأت نہ کر سکی۔ اور یہ خاموشی ایک مرکز تھی ـــــ اس مرکز کے گرد ایک دائرہ کھنچا ہوا تھا ـــــ یہ دائرہ آوازوں سے معمور تھا ـــــ درود و سلام کی آوازیں، وہ آوازیں جو صدیوں سے حرمِ مصطفٰیؐ کی فضاؤں میں طواف کر رہی ہیں ـــــ آوازیں تو ہماری طرح مجبور نہیں ـــــ آوازیں تو فضا کا حصّہ بن

کر بادِ دانیت کا لبادہ پہننے کے بعد تکلیفاتِ شرعیہ سے بلند تر ہو جاتی ہیں ـــــ وہ تو رقصِ عاشقانہ اور طوافِ مستانہ کر سکتی ہیں۔

[حضورؐ ! 'عاشقانہ' اور 'مستانہ' کے ٹکڑوں کے لئے مجھے معاف کر دیجئے ـــــ میں بے نوا ہوں ـــــ ہاں یہ جانتا ہوں کہ آپ نے ابو بکرؓ کو دیکھا تو وہ صدیق ہو گئے، عمرؓ پہ نظر پڑی تو وہ فاروقیت کے مرتبہ پہ فائز ہو گئے، عثمانؓ آپ کی بزم میں آئے تو ہوا یہ کہ ہر دو جہاں سے بے نیاز اس کا دل غنی، علیؓ آپ کے سینے سے لگے تو باب العلم ہو گئے ـــــ سرکارؐ ! عاشقانہ اور مستانہ کے لفظوں پر اپنی خاک پا مل دیجئے تو یہ لفظ ستارے بن جائیں گے۔]

میرے سینے سے بھی ایک نوا بلند ہوئی جو انؐ کی نسبت سے نوائے سینہ تاب بن گئی اور جاوداں آوازوں کے حلقہ میں شامل ہو گئی جو مرکزِ عشق کے گرد کھنچا ہے ـــــ صدیوں بعد کوئی آئے گا اور میری آواز اس کے ہونٹوں سے ابھرے گی اور اس کی آنکھوں سے ٹپکے گی۔

مغرب کی نماز کے بعد میں نے عکسِ محمدی قرآن کے آئینے میں" کا ابتدائیہ خواب گاہِ رسولِ ازل و ابد صلی اللہ علیہ وسلم کے سرہانے بیٹھ کر لکھا ـــــ یہ تحریر شائع ہو چکی ہے اور اب میں اسے نئے سرے سے دوبارہ لکھ چکا ہوں ـ ستر اسی صفحات کی تحریر اب چار سو صفحات سے بھی آگے بڑھ گئی ہے مگر اس تحریر کے ابتدائیہ کو نقل کئے بغیر آگے کیسے بڑھوں۔

" سعودی عرب میں مغرب کے وقت جب موذنِ بیت اللہ اور موذنِ مسجدِ نبویؐ کے ہونٹوں پر اللہ کے ساتھ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا نام دعوتِ صلوٰۃ و فلاح میں آتا ہے تو وقت کی رفتار کا اندازہ کیا جاتا ہے، اور گھڑیاں اس آواز پر اسی طرح متحد ہو جاتی ہیں جس طرح ان دونوں عناصر (توحید و رسالت) نے دنیائے اسلام کو متحد کر رکھا ہے۔

" یہ آواز چودہ صدیوں سے گونج رہی ہے اور یوں محسوس ہوتا

ہے جیسے اس کائنات میں ؏

محمدؐ کا اب تک دھڑکتا ہے دل

اور یہ دل ہمیشہ دھڑکتا رہے گا۔

"یہ نام چودہ سو سال کی مدّت اور عہدِ حاضر کے درمیان ایک پُل کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ نام، یہ اسمِ گرامی جو ایک زندہ وجود ہے، اور سارے کرّۂ ارض میں بسنے والے اہلِ ایمان کے لئے زندگی کی علامت اور تحریک بھی ہے ۔۔ یہ علامت اور تحریک بیت اللہ سے دنیا کے ہر گوشے تک پھیلی ہوئی ہے ۔۔ یہ نامؐ ابرِ کرم کی طرح گنگا سے ٹیگس تک ہر جگہ برسا ہے۔ قرآن نے " سیروا فی الارض " کی تعلیم دی ہے اس سے ایک طرف تو " عاقبۃ المکذبین " سامنے آجاتی ہے اور دوسری طرف محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کے انفاسِ پاک اور زندگی بخش آثار کے حقائق روشن ہو جاتے ہیں۔ صبح تاروں کی چھاؤں میں صلوٰۃ و درود کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے، اور وقت کا کوئی لمحہ ایسا نہیں گزرتا جب نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر دنیا کے کسی گوشے میں صلوٰۃ و درود کے ہدیے نہ پیش کئے جاتے ہوں۔ حضورؐ کے روضۂ مبارک کے سرہانے کھڑے ہو کر افریقہ، ایشیا، امریکہ، یورپ اور آسٹریلیا کے ہر ملک اور خطّے کے لوگ اپنی روح کے ساز پر یہ نغمہ فرشتوں کی ہم نوائی میں رسولِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش کرتے ہیں کہ

" سلام و درود سیّد الکریم پر۔

اے رسولِ عظیم! اے رؤف و رحیم! آپ پر اللہ کی برکتیں ہوں

" اے وہ کہ تو ہماری آنکھوں کی ٹھنڈک ہے اور اللہ کا آخری

پیغام بر: اللہ اور فرشتوں کے سلام میں ہم بھی شریک ہیں۔

" اے نورِ عرش ! اے خیرِ خلق اللہ ! اے رحمت للعالمین!
تجھ پہ لاکھوں سلام۔

" اے یٰسین ! اے طٰہٰ ! اے بشیر! اے سراجِ منیر!
ہمیں مایوس نہ فرمانا۔۔۔ قیامت کے دن تیرے علم کا سایہ ہمارے سروں پہ ہو۔

" یا رسول اللہ ! ہم اپنے ایمان کی تمام کمزوریوں کو جاننے کے باوجود گواہی دیتے ہیں کہ آپؐ نے اللہ کا پیغام ہم تک پہنچا دیا، اُس طرح جو عظیم ترین رسولؐ کے شایاں تھا۔ اور ہم آپ سے شرمندہ ہیں کہ جو فریضہ آپؐ نے اُمت کے سپرد کیا تھا اُسے ہم اچھی طرح انجام نہیں دے رہے ہیں۔

" اے سلطان الانبیاء و مرسلین ! تیری عظمت کی سوگند کہ ہم اپنی زندگی کے نقشے کو بدلنے کی کوشش کریں گے"

مدینہ کے قیام کے دوران بیشتر وقت مسجدِ نبویؐ میں گزرا مگر افسوس یہ قیام اتنا مختصر تھا کہ مسجدِ نبویؐ میں چالیس نمازیں بھی پوری نہ ہو سکیں ۔۔۔ فجر کی نماز کے بعد تین چار روزہ قیام کے دوران گرد و نواح کے آثار دیکھنے نکل جاتا۔

"جنت البقیع" کی خاک میں وہ وجود محوِ خواب ہیں، جو ہمارے وجودوں میں زندہ ہیں۔
زندگی یکتا ہے اسے تکرار کی خو پسند نہیں ہے

پسند اس کو تکرار کی خو نہیں
کہ تو میں نہیں اور میں تو نہیں

لیکن یہاں سوال تکرار کا کب ہے ؟ یہ عثمانِ غنیؓ آسودہ خواب ہیں ۔۔۔ ہر آنکھ کی حیا،

عثمان غنیؓ کی حیا کا ایک جلوہ ہے، جلوۂ متواتر، جلوۂ پیہم ـــــ خاتونِ جنت حضرت فاطمہؓ کے مزار پر حاضری دی تو خیال آیا کہ فاطمہ تو مرتبۂ امومت کا نام ہے جو زندہ و باقی ہے، اور جس سے خاندان بنتا ہے ـــــ خاندان، جو معاشرہ کی بنیادی اکائی ہے ـــــ فاطمہ، ایک وجود کا نام بھی ہے اور حسنؓ و حسینؓ کے نقشِ قدم کو اپنانے والوں کی تخلیق کا مرحلۂ دوام بھی ہے ـــــ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی خدمت میں اپنا سلام پیش کرنے سے پہلے میں نے بیگم کلثوم جیلانی اور ممتاز جعفری کا سلام پیش کیا ـــــ میرا دل تو چاہا کہ میں اُن سے پوچھوں کہ آپ تو خاتونِ جنت ہیں ـــــ ذرا میرے بچوں کے بارے میں تو مجھے بتائیے ـــــ میرا عزمی کیسا ہے؟ میرا اسامہ کیسا ہے؟ آپ انہیں ڈھیر سارا پیار کرتی ہیں نا؟ میرے بچے علی اصغر کے ساتھ کھیلتے ہوں گے؟ اور روزِ حشر وہ آپ کی انگلی پکڑ کر ہماری پیشوائی کریں گے اور آپ سے کہیں گے کہ بی بی اماں! یہ ہمارے ابّو ہیں۔ انہیں معاف کرا دیجئے نا ـــــ اور پھر ـــــ مگر میں امومت کے زمزم میں نہا گیا۔ ہونٹ کھولنے سے پہلے ہی میں خود عزمی اور اسامہ بن گیا۔ اور پھر جنت البقیع میں میرا بچپن کھڑا تھا ـــــ اور میرے بچپن کی وسعت میں باغِ جنت کا کتنا بڑا ٹکڑا آ گیا ـــــ اور اُس پر گھٹا برسنے لگی اور پھر کھل گئی ـــــ پھر جو خوشبو پھیلی اُس میں سب سے نمایاں خوشبو خاتونِ جنت کے وجود کی خوشبو تھی ـــــ وہ عطر، جسے مجموعہ کہا جاتا ہے ـــــ خوشبو کی پہلی لہر آئی، اس میں شفقتِ رسالت کے سارے رنگ تھے۔ پھر مجھے اپنی جدۂ ماجدہ کے ہاتھوں میں جَو کی روٹی کا ٹکڑا نظر آیا اور پھر انہوں نے وہ ٹکڑا مجھے عطا کر دیا ـــــ وہی لمحہ تھا کہ میری خاک میں چھپے ہوئے فقر کا شرارہ بیدار ہو گیا ـــــ اور اُس لمحہ سے آج تک یہ اُسی لقمہ کا اثر ہے کہ جس نے میرے مُنہ پر تھو کا، میں کلمۂ طیبہ پڑھتا ہوا اس کی مجبوری کے سینے سے اُتر آیا۔

جنت البقیع میں قبروں پہ آثار نہیں ہیں، کتبے نہیں ہیں ـــــ شریعت کے تقاضے برحق، مقبرے نہ بنوائے جائیں ـــــ درست، قبریں کچی رہیں ـــــ لیکن ناموں کی تختیاں تو لگائی جا سکتی ہیں ـــــ کینیڈی نے امریکہ کا صدر بننے کے بعد آئرلینڈ میں اپنی جڑوں کی تلاش شروع کی۔

— اور ہم تو جب اپنے آپ کو اپنے دیس میں تلمی پودے سمجھنے پر مجبور کیے جاتے ہیں تو جنت البقیع کا رُخ کرتے ہیں — ہماری جڑیں یہاں ہیں — مگر — دوستو! اب مقام سکوت و حیرت ہے۔

میرے ساتھ ساتھ سوڈانی مسلمانوں کا ایک گروہ تھا — اُن کے رہنما نے ایک مقام پر اُن سے کہا کہ "یہ امام زین العابدین کی قبر ہے" — اور گروہِ مسلمین نے فاتحہ پڑھا۔ چند قبروں کے بعد اس گائیڈ نے ایک دوسری قبر کو امام زین العابدین کی قبر قرار دیدیا، اور ان سادہ لوح مسلمانوں نے دوبارہ فاتحہ پڑھ لی — اب میں کس سے پوچھوں کہ میرے جد کی قبر کہاں ہے؟ میرا وہ جد، جو حسین ابن علی، فاطمۃ الزہرا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے واسطے سے وہ قطرۂ خون ہے جو میرے رگِ گلو میں ہے۔

ویسے تو یقین کے ساتھ یہ بات معلوم ہے کہ حضرت زین العابدینؓ کی قبر جوارِ فاطمہؓ میں ہے لیکن یہاں تو بات ایک سوال کی ہے۔

جنت البقیع میں اپنے چبوترے کی بنا پر حضرت عثمانِ غنیؓ کی قبر کے آثار خاص نمایاں ہیں۔ یہاں وہ سو رہا ہے جس کے خون نے قرآن کریم کے صفحات کو گلنار کر دیا ہے۔ جس نے اپنے خون کو قرآن کے ورقِ ابد آثار کے حوالے کر کے حرمتِ دیارِ مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کو بچا لیا — قرآن حکیم کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی موجودہ صورت میں ایک مرتب کتاب کے طور پر ملتِ مسلمہ کے حوالے کر کے اللہ کے پیغام کی تکمیل فرمائی — اس کتاب کے اسماء میں مصحفِ عثمانی بھی شامل ہے، اور وہ حضرت عثمانؓ کے خون کا صدقہ ہے۔ حضرت عثمانؓ نے قرآنِ حکیم کی سورتوں کو خود جمع نہیں فرمایا، بلکہ قرآنِ حکیم کو وسیع سلطنت میں یوں پھیلایا کہ اس کے ہر نقطہ پر امت کا ایمان ہے، اور یوں وہ جامع القرآن ٹھہرے۔

بی بی سعدیہ حلیمہؓ بھی جنت البقیع میں مدفون ہیں — حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی رضاعی والدہ — وہ جن کی خوش نصیب آنکھوں نے خورشیدِ رسالت کی اولین کرنوں کا جی بھر کر نظارہ کیا تھا۔

ایک صبح میں نے ٹیکسی لی — ڈرائیور صاحب اردو خوب بولتے تھے۔ حج کے دنوں میں معلم — باقی دنوں میں گائیڈ اور "صاحب سیارہ" — ان کی ٹیکسی میں نواحِ مدینہ میں

اپنی تاریخ کے مشاہدے کے لئے نکلے ـــــ میں نے ٹیکسی والے سے کہا کہ میں سب سے پہلے میدانِ اُحد دیکھنا چاہتا ہوں کہ شہدائے اُحد کے حضور اپنا سلام پیش کر سکوں۔

یہ میدانِ اُحد ہے ـــــ شہدائے اُحد کے مزار پر دُور ہی سے سلام پیش کیا ـــــ قریب جانے کی اجازت نہ تھی ـــــ معلوم نہیں کیوں؟ ـــــ یہی وہ خاک ہے جہاں عمِ رسولؐ، حضرت حمزہ رضؓ دفن ہیں۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہر جلیل القدر صحابیؓ کے نقوشِ قدم ہمارے لئے رہنمائی کے ستاروں کی طرح ہیں ـــــ لیکن خلفائے راشدین کے علاوہ حضرت حمزہؓ، حضرت ابوذر غفاریؓ، حضرت بلالِ حبشیؓ، حضرت سلمان فارسیؓ، حضرت خالد بن ولیدؓ، حضرت ابو عبیدہؓ، حضرت کعب بن مالکؓ، حضرت سعد بن وقاصؓ، حضرت ابو دجانہؓ، حضرت زید بن سکنؓ، حضرت عبداللہ بن عمرؓ، حضرت زبیرؓ اور حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہم کے اسمائے گرامی اور ان کی زندگی کے واقعات میرے لئے اسلام کے قرنِ اولیٰ کے کوہِ ندا کی وہ چوٹیاں ہیں جو مجھے اپنی طرف بلاتی ہیں اور جن کی آوازوں کی بازگشت میں اپنی رُوح کے نہاں خانوں میں سنتا ہوں۔

یہ حضرت حمزہؓ ہیں ـــــ شکار سے واپس آئے ہیں ـــــ سارا دن صحرا کی گرد میں شکار کا تعاقب کیا ہے۔ چہرے پر غازۂ گردِ صحرا ہے۔ عقابی آنکھوں کی چمک کے سامنے نظر نہیں ٹھہرتی۔ کنیز بتاتی ہے کہ ـــــ "آج آپ کے بھتیجے کے ساتھ ابوجہل نے گستاخی کی ہے" ـــــ گھر کی دہلیز پر قدم رکھے بغیر حمزہؓ خانۂ کعبہ کا رُخ کرتے ہیں ـــــ صحنِ کعبہ میں ابوجہل اپنے ساتھیوں کے ساتھ حلقہ جمائے بیٹھا تھا ـــــ حمزہؓ کی آواز گونجی ـــــ آواز، جس میں تلوار کی کاٹ تھی ـــــ "سُن لے۔ حمزہ مسلمان ہو گیا ہے ـــــ اب جو آنکھ محمدؐ کی طرف بُرے ارادے سے اٹھے گی حلقۂ چشم سے نکال لی جائے گی"ـــــ

اور پھر مدینہ کی اسلامی ریاست قائم ہوئی اور وہ معرکہ پیش آیا جسے قرآن نے "یومِ فرقان" قرار دیا ہے۔ اس معرکۂ بدر میں کفارِ مکہ کے کتنے ہی اکابر شمشیرِ حمزہؓ جگر دار کے گھاٹ اترے ـــــ ان میں ہند

کا باپ عتبہ تھا، جبر بن مطعم کا چچا تھا۔ اور جب بدر کی شکست کے انتقام کے لئے کفر کی طاقتیں اُحد میں جمع ہوئیں تو ہندہ نے جبر کے غلام وحشی کو حضرت حمزہؓ کو شہید کرنے پر آمادہ کیا۔ وہ نیزہ زنی میں فرد تھا۔ اور حمزہؓ کی شہادت کی قیمت اُس کی آزادی ٹھہری۔ حضرت حمزہؓ اسی غلام کے نیزہ سے شہید ہوئے۔ ہندہ نے ان کا کلیجہ چبا کر کھانے کی کوشش کی۔

میری نظروں کے سامنے شہدائے اُحد کا مدفن تھا اور تاریخ اپنے آپ کو دہرا رہی تھی۔ اُحد کی تاریخ جو میری تاریخ ہے ــــ اور میں نے صدیوں کا سفر پل بھر میں کر لیا ہے ــــ حضرت ابن نضر کا اسم گرامی لوحِ ذہن پر چمکا ــــ جب سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی شہادت کی افواہ میدانِ اُحد میں عام ہوئی تو حضرت عمرؓ نے مایوسی کے عالم میں تلوار پھینک دی۔ ابن نضرؓ نے کہا۔ "عمرؓ! یہ کیا کرتے ہو" دوست، اب جی کر کیا کریں گے۔ حضورؐ کے بعد زندگی زہر ہے شہد نہیں" ــــ ابن نضرؓ کے الفاظ نے ایک طرف تو فاروقِ معظمؓ کو اپنی ذات تک دوبارہ پہنچا دیا اور دوسری طرف وہ صفِ دشمناں میں اس شان سے لڑے کہ جسم نے تلواروں اور نیزوں کے اسی (۸۰) سے زیادہ زخموں کا استقبال کیا۔

غزوۂ اُحد کا ہر لمحہ جاں نثاری اور جاں سپاری کی کئی صدیاں اپنے آغوش میں لئے ہوئے ہے۔ حضور سرورِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی تلوار فضا میں بلند کی اور فرمایا "اس تلوار کا حق کون ادا کرے گا" ــــ شمعِ سرکار کے پروانے آگے بڑھے ــــ دیوانہ وار ــــ مگر اس تلوار کا حق ادا کرنے کی سعادت حضرت ابو دجانہؓ کے حصّہ میں آئی ــــ دشمنوں کی صفیں درہم برہم کر کے جب دُور تک پہنچ گئے تو ہندہ سامنے آئی ــــ خوف کے مارے اس کا رنگِ رُخ زرد ہو گیا ــــ حضرت ابو دجانہؓ نے کہا ــــ "جا، سامنے سے ہٹ جا ــــ یہ رسولِ ربّ العالمین کی تلوار ہے۔ یہ عورت کا خون نہیں بہا سکتی"۔

اور یہیں اسی میدان میں جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے گرد دشمنوں نے گھیرا ڈال دیا تو آپؐ نے فرمایا "کون مجھ پر اپنی جان نثار کرے گا"، حضرت زیاد بن سکن پانچ انصاریوں کے ساتھ آگے

بڑھے۔ عرض کیا "آپ ہمیں اپنی زندگی، اپنے ماں باپ، اور اپنی اولاد سے زیادہ عزیز ہیں، شکر ہے کہ آج ہم اپنے ایمان کی گواہی اپنے لہو سے دیں گے۔" یہ جاں نثار اللہ کے قہر کی طرح کفار پر ٹوٹ پڑے ___ نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے گرد کفر کا حصار ٹوٹ گیا ___ اور زیاد بن سکنؓ اپنے ساتھیوں کے ساتھ اُحد کی زمین کو شفق رنگ بنا گئے ___ حضرت زیادؓ خاک پر پڑے تھے، یوں جیسے جادۂ صد ہزار سالہ کو طے کر کے جنت الفردوس میں پہنچ گئے ہوں ___ فخرِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے کہا ___ "زیاد کے لاشے کو میرے قریب لاؤ۔" زیادؓ کے لاشہ کو قریب لایا گیا تو انہوں نے آنکھیں کھول دیں ___ راہِ ابد کا مسافر زبانِ رسالت سے اس جملہ کے سننے کے لئے ابھی اس خاکدان سے روانہ نہیں ہوا تھا ___ اب پائے رسالت کی فلک سامانی تھی اور زیاد کے لب تھے ___ زیاد نے ان قدموں پر اپنے لب رکھے اور یوں تسلیمِ جاں کو زندگیٔ جاوداں بنا دیا ___ یہ بوسہ جنت کے مسافر کا زادِ راہ بنا اور مسافر اپنی منزل پر پہنچ گیا۔ میں نے میدانِ اُحد سے کہا "اے اُحد کے ذرّو! مجھے بتاؤ کہ زیاد بن سکنؓ نے تمہارے کس گوشے میں جان دی تھی۔ میں اس گوشہ کی خاک کو اپنی پیشانی پر مل لوں" ___ لیکن اُحد کے ذرّوں نے مجھے جادۂ توحید کی یاد دلائی اور میں آنسوؤں کے چراغ، جلتے ہوئے روشن چراغ، خاکِ اُحد کے سینے میں اتارتا رہا ___ کون جانے کہ جس جگہ میں نے یہ چراغ روشن کئے تھے وہی بوسہ گاہِ زیاد ہو۔

ٹیکسی والے کی کرخت آواز نے اس سفر کے دھاگے توڑ دیئے۔ وہ راستے جو میں نے آنسوؤں سے روشن کر کے ماضی سے واپس لے لئے تھے، پھر حال کے اندھیروں میں چھپ گئے ___ "اب چلو بھی، کب تک کھڑے رہو گے، چند ریال دے کر تم دن بھر تو مجھے تنگ نہیں کر سکتے۔"

میں نے اس سے کچھ نہیں کہا۔ فاتحہ کو مکمل کیا اور دوسری "زیارتوں" کی طرف چل پڑا۔ جس ترتیب سے یہ مقامات دیکھے وہ تو یاد نہیں ___ اور پھر اس ترتیب کی کچھ ایسی اہمیت بھی تو نہیں ___ اہمیت تو ان نقوش کی ہے جنہیں نقوشِ عہدِ رسالت کہیئے۔ وہ نقوش جو اس عہد کو ہمارے لئے "حال" بنائے ہوئے ہیں۔

مسجدِ قُبا مدینہ منورہ سے تین چار میل کے فاصلے پر ہے ـــــ جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم مکہ سے ہجرت فرما کر یثرب تشریف لائے تو قُبا کے مقام پر کوئی دو ہفتے قیام فرمایا ۔ یہاں سب سے پہلے مسجد تعمیر کی گئی ۔ مسجدِ قُبا جو اسلامی ریاست کی تاسیس کی علامت بھی ہے اور اسلامی معاشرہ میں مسجد کی مرکزیت کا اشارہ بھی ۔ مسجدِ قُبا کے قریب ہی ایک ویران جگہ منافقوں کے انجام کی کہانی آج بھی خاموشی کی زبان سے سنا رہی ہے ـــــ مسجدِ ضرار ـــــ جو مسجد کے پردے میں اسلام کے خلاف سازشوں کا مرکز تھی ـــــ پھر "سازش" یہ کی گئی کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے اس مسجد میں کسی نماز کی امامت کرا کے عام مسلمانوں کو "دھوکہ" دیا جا سکے ۔ مگر وحی الٰہی نے اس سازش کو بے نقاب کر دیا ـــــ اور مسجدِ قُبا کی بنیاد تو تقویٰ پر رکھی گئی تھی ۔

لَمَسْجِدٌ اُسِّسَ عَلَی التَّقْوٰی مِنْ اَوَّلِ یَوْمٍ

اَحَقُّ اَنْ تَقُوْمَ فِیْہِ (سورۂ توبہ : ۱۰۸)

"البتہ وہ مسجد جس کی بنیاد دھری گئی تقویٰ پر اوّل دن ـــ وہ لائق ہے کہ تو کھڑا ہو اس میں ۔"

میں نے مسجدِ قُبا میں دو رکعت نمازِ نفل ادا کی ـــــ مسجدِ نبوی ہو، مسجدِ قُبا ہو یا مسجدِ قبلتین، یہاں سجدہ کرتے ہوئے یہ احساس ہوتا ہے کہ ہمارے سجدے کن سجدوں کے وارث ہیں ـــــ یہی وہ قطعاتِ ارض ہیں جن پر حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ کرام نے اللہ کے حضور سجدہ کر کے مقامِ عبدیت کو سوز و دردِ آرزومندی سے ہم کنار کر دیا، اور انسان کو یہ کہنے کے قابل بنا دیا کہ

؎ مقامِ بندگی دے کر نہ لوں شانِ خداوندی

اِسی خاک میں زندہ سجدے چمک رہے ہیں اور دُنیا کے ہر گوشے سے آنے والے مسلمانوں کے سجدوں کو ابدیت کا حصّہ بنا رہے ہیں ۔

اِسی مسجدِ قُبا کے قریب ویران زمین مسجدِ ضرار کی نہیں بلکہ منافقت کی بے ثمری کا اشارہ ہے ـــــ یہ وہ ٹکڑا ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بعض صحابہ کرامؓ کو اس پر مکان بنانے

کی اجازت دی، مگر حضورؐ کے اُن فرماں برداروں اور جاں نثاروں نے یہی کہا کہ "آپؐ پر ہمارے ماں باپ قربان! مگر ہمارا یہ امتحان نہ لیجیے ـــــ وہ جگہ جہاں کفر نے نفاق کا لبادہ پہنا اُسے ہم اپنی سکونت کی جگہ کیسے بنائیں" ـــــ وہ تو رسولؐ کے ساتھی تھے، یہاں تو گھاس کی پتّیوں اور پودوں نے بھی اُگنے سے انکار کر دیا۔

مسجدِ قبلتین میں دوگانہ ادا کرتے ہوئے یہ بات یاد آگئی کہ تحویلِ قبلہ کی آیت اس وقت نازل ہوئی جب ہادیٔ برحق صلی اللہ علیہ وسلم ظہر کی نماز کی امامت فرما رہے تھے، اور شاید وہ تیسری رکعت تھی ـــ نماز کے دوران ہی حضورؐ نے بیت المقدس کی طرف سے رُخ موڑ کر سوئے بیت الحرام کر لیا، اور اُسی لمحہ سے یہ قوم 'بیت الحرامؑ' کو اپنی سمت سمجھتی ہے۔ اطاعت کی ایسی نظیر تاریخ میں اور کہاں ملے گی ـــــ تحویلِ قبلہ نے قومِ رسولِ ہاشمی کو قیدِ مقام سے بلند کر کے رضائے الٰہی کا تابع بنا دیا، ورنہ قبلہ کو بھی بُت بنا لیا جاتا ـــــ مسجدِ قبلتین میں اس سلسلہ میں کتنے ہی نکتے ذہن میں آئے ـــ بیت اللہ، اس زمین پر خدا کا پہلا گھر ہے، پھر تعمیرِ ابراہیم علیہ السلام ہے، اور ہم ملّتِ ابراہیمی ہیں ـــــ اس تحویل سے یہ بات بھی ابھر کر سامنے آگئی کہ تحویلِ قبلہ یہود پر کتنی گراں گزری۔

مسجدِ قبلتین سے مسجدِ قُبا کے راستے میں چار تاریخی مسجدیں پڑتی ہیں ـــــ اور پھر نواحِ مدینہ میں سات مسجدوں کا سلسلہ جس میں سے اب غالباً پانچ باقی ہیں ـــــ مسجدِ سلمان الفارسی، مسجدِ سیّدنا علی، مسجدِ سیّدنا عمر، مسجدِ سعد بن معاذ اور مسجدِ سیّدنا ابوبکر صدیق ـــــ ان سب مسجدوں میں نفل نمازیں پڑھنے کی سعادت حاصل ہوئی۔ ہر مسجد کا نام، اُن کی یاد دلاتا، جن کی نسبت سے یہ مسجدیں ہماری متاعِ عزیز اور امانت ہیں ـــــ ہم تو سیّدنا ابوبکرؓ، سیدنا عمرؓ، سیّدنا علیؓ اور دوسرے صحابہ کرامؓ کے سجدوں کے وارث ہیں ـــ ان مسجدوں میں سجدہ کرنے والوں کو یہ نکتہ یاد آتا ہے کہ وہ "خاشعین" میں شامل ہوں کیونکہ یہی خشوع ان کی فلاح کی ضمانت ہے۔ یہ خشوع، اللہ کے حضور سب کچھ بھول جانے کا نام ہے ـــ اپنے اعضاء کے سکون کے ذریعہ آدمی

اس کیفیت تک پہنچتا ہے۔

جنت البقیع سے لے کر ان مسجدوں تک بار بار یہی خیال ذہن ستاتا رہا کہ ہم اپنے ملی آثار اور تاریخ کے کیسے مجرم ہیں۔ جن قوموں کے پاس تاریخ نہیں ہوتی وہ تاریخ ایجاد کرتی ہیں اور یوں زمان و مکاں میں جڑ پکڑتی ہیں۔ "GEORGE WASHINGTON SLEPT HERE" تو ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں ایک لطیفہ بن گیا ہے، مگر اس سے اپنی تاریخ سے اقوام کی دلچسپی کا اندازہ ہوتا ہے۔

آج بھی تو سعودی عرب میں جلالتہ الملک فلاں بن فلاں کے ناموں کی یادگاری تختیاں نصب کی جاتی ہیں، پھر اگر جنت البقیع کے سونے والوں کے ناموں کی تختیاں لگا دی جائیں تو عقائد کی دنیا میں کون سی قیامت آجائے گی۔؟ ـــــ حضور سرورِ کائنات کے مولد میں "مکتب" دیکھ کر اگر دل لرز جائے تو یہ ایمان کی علامت ہے ـــــ اگر زمین کے کسی ٹکڑے کی طرف اشارہ کر کے کوئی کہے کہ یہاں "خانۂ ارقمؓ" تھا اور وہاں گدھے بندھے ہوں تو کسی مسلمان کے قلب کی کیا کیفیت ہو گی؟ ـــــ یہی تو وہ جگہ تھی جہاں فاروق اعظمؓ نے حاضری دے کر اپنے ایمان کا اعلان کیا تھا اور مکّہ کی وادیاں نعرۂ تکبیر سے گونج اٹھی تھیں ـــــ مدینہ منورہ کے آثار اور مساجد بھی اپنی عظیم میراث سے ہماری دوری کی نوحہ خواں ہیں۔

آئیے اس ذکر سے، جو حدیثِ کائنات و تذکرۂ روزگار کی طرح تلخ ہوا جا رہا ہے، گریز کر کے مسجدِ نبویؐ کا رخ کریں ـــــ مسجدِ نبویؐ، جو مدینۂ منورہ میں غلامانِ رسولِ عربیؐ کی زندگی کے محور کا درجہ رکھتی ہے اور زندگی کے لمحات کے دائرے اسی محور اور مرکز کے گرد کھنچتے ہیں ـــــ مسجدِ نبویؐ میں قدم رکھنے سے پہلے اس مسجد کے بارے میں آدمی کیا کچھ نہیں پڑھتا ـــــ یہ مسجد جس میں سجدہ کی تمنا بھی مسلمان کی زندگی کی معراج ہے ـــــ مسلمان دنیا کے کسی گوشے میں ہوں وہ ہر نماز کے وقت مسجدِ حرام کی طرف رخ کرتے ہوئے جہاں حرم کعبہ کے بارے میں سوچتا ہے وہاں مسجدِ نبویؐ کے سبز گنبد بھی نگاہوں میں ابھرنے لگتے ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں ذکر و فکر کے اسالیب میں بھی یہ مسجد شامل ہے "گنبدِ خضریٰ کے مکیں"، "سبز گنبد کے مکیں"، "اے حرمِ مصطفیٰ"، ـــــ جیسے ٹکڑوں میں ہماری عقیدت نے لفظوں، حرفوں اور آواز کو دل کی دھڑکن عطا کر دی ہے ـــــ حج کے سفرنامے، میں نے ہمیشہ

بڑے شوق سے پڑھے تھے ـــــ ان سفرناموں میں مولانا عبدالماجد دریا آبادی کے "سفر نامۂ حجاز" کی یاد آج بھی تازہ ہے ـــــ یہ سفرنامہ میں نے لڑکپن میں پڑھا تھا ـــــ یہ تذکرے جو کتابوں میں پڑھے تھے، جذبۂ عشق کے طفیل مدینۂ منورہ پہنچنے سے پہلے ہی جیسے نظارہ کی حد تک پہنچ گئے تھے۔ یہ "ستونِ حنانہ" ہے، جس کا سہارا لے کر دنیا کا فصیح ترین انسان خطبہ ارشاد فرماتا تھا۔ یہ ستونِ عائشہؓ ہے جس کے بارے میں کہا گیا ہے کہ اگر لوگوں کو اس کی عظمت کا پورا احساس ہو جائے تو یہاں نماز پڑھنے کے لئے قرعے پڑنے لگیں ـــــ اور وہ "ستونِ سریر" ہے جہاں ہادیٔ برحق علیہ الصلوٰۃ والسلام اعتکاف فرماتے تھے۔ یہ "ستونِ وفود" ہے ـــــ یہ جگہ مسجدِ نبویؐ میں درس گاہِ مصطفٰیؐ کا درجہ رکھتی ہے۔ یہاں حضورؐ شریعت کی تعلیم دیتے تھے ـــــ اور وہ روشن ٹکڑا مقامِ جبریل ہے ـــــ وہ رہا "ستونِ علیؓ" اور یہ ہے ستونِ تہجد ـــــ لیکن مسجدِ نبویؐ میں جو بھی لمحے گزرے ان میں یہ نام ذہن میں بھی نہ آئے ـــــ مسجدِ نبویؐ مجموعی طور پر جیسے ذات پر چھا گئی تھی ـــــ یہ مسجد ایک کُل کے طور پر ابھری ـــــ ایک وحدت ـــــ اور اس کُل میں گم ہونے کے ان لمحات میں روضۂ شریف کے علاوہ اگر کسی مقام کا احساس ذہن میں رہتا تو وہ روضۂ جنت تھا۔

مسجدِ نبویؐ میں خود فراموشی کے ساتھ بیداری کا عجیب سا احساس گھُل مل جاتا ہے۔ ایک طرف حضورِ آیۂ رحمتؐ میں اپنے آپ کو گم کر دینے کا جذبہ ـــــ اور دوسری طرف "با محمدؐ ہوشیار" کا احساس ـــــ یہ جذبہ اور یہ احساس ایک دوسرے کی تکمیل یوں کرتے ہیں کہ دیارِ رسولؐ میں آدمی کو اپنی زندگی پر جدیدہ تکمیل کا گمان ہونے لگتا ہے۔

مدینہ شریف میں مسجدِ نبویؐ کے باہر چاروں طرف پھیلی ہوئی زندگی عہدِ رسالت کی زندگی سے کتنی مختلف ہے۔ جدید ترین طرز کی گاڑیاں، سڑکوں پر پھیلتی ہوئی ـــــ مختلف امصار و ولایات کے لباس ـــــ لوگ اور زبانیں ـــــ لیکن ہر لمحہ یوں محسوس ہوتا کہ نگاہِ رسالتؐ دیکھ رہی ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہماری جنبشِ مژگاں تک کے شاہد ہیں ـــــ اور اس احساس کا نتیجہ یہ ہے کہ مدینہ کی گلیوں میں وہ شور نہیں جو مکہ میں حرم شریف کی قریبی گلیوں میں سنائی دیتا ہے ـــــ یہاں

جیسے آج بھی ہر صاحبِ ایمان اپنے آپ کو اس حکمِ قرآنی کا مخاطب سمجھتا ہے کہ "اے ایمان والو! اپنی آواز کو نبیؐ کی آواز سے بلند تر نہ کرد" ـــــ یہ حکم گفتگو کو سرگوشی بنا دیتا ہے ـ مدینہ کی کھجور کی شیرینی یہاں کے رہنے والوں کے لہجہ میں بھی ملتی ہے اور یہ اسی شیریں دہنؐ کے لہجے اور ذات کا صدقہ ہے جو ہر شیرینی کا معیار ہے ـ مدینہ میں مسجدِ نبویؐ کے باہر ان آنکھوں نے یہ دیکھا کہ اگر دو آدمیوں کا لہجہ ذرا تلخ ہوا تو کسی گزرنے والے سے دُرود شریف پڑھنا شروع کیا، اور لہجہ کی تلخی، سکوت یا نرم گوئی میں بدل گئی ـ

ستمبر میں مدینہ منورہ میں دن خاصے گرم تھے اور راتیں بہت خوشگوار اور خنکی آمیز تھیں ـــ دن میں، میں اور عاکف عام طور پر کچھ نہ کھاتے، دو تین مرتبہ پھلوں کا رس پی لیتے ـ خربوزے کا رس یا شربت پہلی بار یہیں پیا ـــــ یہ مشروب، کھانے کی تسکین بھی رکھتا ہے ـ ایسا میٹھا خربوزہ زندگی میں کبھی نہیں چکھا تھا ـــ لکھنور کے خربوزوں پر جو ناز تھا وہ ختم ہو گیا ـــ اور پھر بہت سے پھلوں کا "مکسڈ جوس" ـــ انار رس ـــــ ہر بار رس پیتے ہوئے یہی خیال ذہن میں آتا کہ مدینہ کے پھلوں کو بھی آقائے دو جہاںؐ کے خادموں اور مہمانوں کا کتنا خیال ہے ـــ اور یہ بھی سوچتا کہ شاید دوسرے ملکوں سے درآمد کئے ہوئے پھلوں کی شیرینی بھی ہوائے مدینہ کی مرہونِ منت ہے ـــ

فندق بہا الدین سے ملی ہوئی ایک "رس دوکان" سے ہم لوگ رس پیتے تھے ـــ شاید دوکان کے نوجوان مالک کا نام علی تھا ـ دو تین دن کے قیام کے دوران ہی علی سے دوستی کا ایک رشتہ قائم ہو گیا ـ اس کا ثبوت بھی کوئی ڈیڑھ سال بعد عملی طور پر ملا ـــــ اس تذکرہ کے لئے آپ کو واپسی کے سفر کی سرگذشت تک انتظار کرنا پڑے گا ـ

وقت، شہرِ رسولؐ میں کتنی آہستگی اور کتنی تیزی کے ساتھ گزر رہا تھا ـــــ آہستہ خرامی ایسی کہ ہر دن، یومِ تخلیق معلوم ہوتا اور رفتار ایسی کہ ایک لمحہ میں چودہ صدیوں کی مسافت طے ہو جاتی ـ آخر رخصت کی گھڑی آئی ـــ وہ لمحہ آیا کہ روضۂ رسولؐ کے سرہانے کھڑے ہو کر ملکوں کی چلمن پر ستاروں کے جھرمٹ میں گمؐ، نظر نے مرقدِ رسولؐ کا بوسہ لیا اور ہونٹوں پہ فراقیہ بول آگئے

— یہ الوداعی سلام تھا

"الوداع یا رسول اللہ

الفراق یا نبی اللہ

اے اللہ کے حبیب! مجھے اذنِ سفر دیجئے کہ زندگی مجھے اپنی طرف بلا رہی ہے، ورنہ تمنّا تو یہی ہے کہ گنبدِ خضریٰ کی دید ہی زندگی بن جائے۔

آپؐ کے اللہ سے دعا ہے کہ وہ آپؐ کی خدمت میں میری اس حاضری کو آخری نہ بنائے، اور مجھے آپؐ کی بارگاہ میں حاضری کا دوبارہ بلکہ بار بار موقع دے۔

لیکن اگر میں اس خاک دان سے رخصت ہو گیا تو آج کے دن سے قیامت کے دن تک کے لئے آپؐ کو اپنی شہادت، اپنی امانت، اپنے عہد اور وعدہ کا امین بناتا ہوں۔

میری شہادت، میرا عہد اور میری امانت یہ ہے کہ اللہ کے سوا کوئی پرستش کے لائق نہیں، وہ یکتا ہے اور اس کا کوئی شریک نہیں۔ اور میں یہ بھی گواہی دیتا ہوں کہ آپؐ اس کے رسول اور عبد ہیں۔

الوداع یا رسول اللہ

الفراق یا نبی اللہ"

بحضورِ سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم

قصیدہ بُردہ شریف کا ایک نقش

نبیؐ محتشم! تیرا گدائے بے نوا کشفی
بہ چشمِ نم ترے دامن کا سایہ ڈھونڈھنے آیا
ہر اک جذبہ ہے میرا شعلۂ بے باک کے مانند
جسے اشکِ ندامت سے ترے دربار میں دھولوں
مری آنکھیں مرے عجز و ندامت کی گواہی ہیں
تری عصمت مرے ہر جرم کو سنگیں بناتی ہے
عبادت کی شبِ بیدار میں قدموں پہ سوجن تھی
کبھی فاقوں میں پتھر جسمِ نازک سے بندھے تیرے
اِدھر میں ہوں کہ اکثر جسم کے جھوٹے تقاضوں پر
حُدودِ شرع کو توڑا

محمدؐ سید الکونین ! تو ہے آمرِ ناہی
ترا ہر قول سچّا ہے
شفاعت کی توقع تیرے دامن تک مجھے لائی
ترا دامن کسی مضبوط رسّی کی طرح اب ہاتھ میں آیا
یہ رسّی جادۂ راہِ صفا معلوم ہوتی ہے
حبیبِ کبریا ! رتبہ کسے معلوم ہے تیرا
تری شفقت نے حیرانی کے ہر گرداب کو ساحل بنا ڈالا
تری قربت میں دوری کس قدر بے چین رکھتی ہے
تری دوری میں قربت کی ادا ، تسکینِ جانِ دیدہ و دل ہے
ترا خُلقِ مجسّم ، پرتوئے اسمائے حُسنیٰ ہے
شرف میں بدرِ کامل کی طرح یکتا
شگوفے کی طرح آغوشِ خوشبو ہے
ترا جود و کرم دریا کی موجوں کی طرح وافر
تری ہمّت مثالِ دہر ہے گویا
ترے الفاظ روحِ نطقِ انسانی
تبسّم جیسے آویزہ ہے گوشِ حسنِ آدم کا
وہ خاکِ جسمِ طاہر، خالقِ خوشبوئے بے پایاں
مشامِ جاں معطر ہو گیا جس سے

ولادت مصطفوی صلی اللہ علیہ وسلم

ترے آتے ہی کنگورے گرے ایوانِ کسریٰ کے
ہر اک آتش کدہ افسوس سے بھرنے لگا آہیں
یہ کیسا انقلاب آیا کہ آتش بن گیا پانی
ترے انوار اک زندہ شہادت کی طرح روشن
نگاہِ کفر وظلمت ہوگئی اندھی
نگاہِ کفر نے انوار کی بارش نہیں دیکھی
سماعت چھین لی کفار کی رعدِ ولادت نے
شہابِ سُرخ کی مانند شعلوں کی ہوئی بارش
کہ جن کے خوف سے بُت گر پڑے بے اختیاری میں
شیاطیں اس طرح بھاگے کہ جیسے ابرہ کی فوج بھاگی تھی

دعوت

تری دعوت سے پتھّر بن گئے انساں
ترے ساتھی تھے ابرِ رحم کے ٹکڑے
جو تیرے ساتھ چلتے تھے
تو ان کا سایہ تھا وہ سائے تھے تیرے

تیرے قلبِ منوّر سے جو نسبت تھی
اسی سے چاند روشن ہے
زمانے نے ستم جب بھی کیا مجھ پر
ترے دامانِ رحمت میں جگہ ڈھونڈھی
ترے دستِ مبارک نے غنی تر کر دیا مجھ کو
زمانہ کیا مجھے دے گا
میں تیرے در کا سائل ہوں
ترا قلبِ مبارک خواب کی وادی میں کب سویا
نبوّت کی صَداقت کی نشانی خواب تھا تیرا
ہر اک لمحہ تری دعوت کا جیسے آیتِ کبریٰ
وہ آیت، جو سپیدی کو سیاہی سے جدا کر دے

فی ذکر شرف القرآن

کتابِ معتبر سب سے بڑا ہے معجزہ تیرا
ہر اک آیت ہے جس کی عدل کے میزان کی مانند
زمانے کی ہر اک گردش نے اس کو اور چمکایا
کتابِ معتبر کی آیتیں امواجِ دریا ہیں
جو ٹکراتی ہیں آکر ساحلِ مقصودِ انساں سے
اسی "نورِ مبیں" سے آنکھ کو ٹھنڈک ہوئی حاصل

یہ وہ پانی ہے جو دوزخ کی آتش کو بجھاتا ہے
یہ آیاتِ کریمہ حوضِ کوثر ہیں
گنہ گاروں کے منہ دُھل کر ہوئے روشن
اسی سے کوئلہ آخر بنا ہیرا
مساوات واخوّت کے سبق اس میں
نظامِ عدل کی بنیاد بنتے ہیں

فی ذکر معراج النّبی صلی اللہ علیہ وسلّم

وہی ذاتِ مُبارک آیتِ معراجِ انساں ہے
حرم سے بیتِ اقدس تک
محمّد مصطفیٰ معراجِ آدم کے امیں بن کر
بلندی کے نشاں بن کر
افق پر جگمگاتے ہیں
یہ تارے، کہکشاں، انجمِ سحر، خورشیدِ خاور آج تک ہمدم
اُسی معراج کی افسانہ خوانی کرتے جاتے ہیں
فضائے بے کراں میں ذرۂ خاکی
اسی معراج کے نقشِ کہن کو ڈھونڈھنے نکلا
گروہِ مسلمیں! آگے بڑھو تاروں کو اب چھو لو
زمیں کی پستیوں کو آسماں کر دو

فی ذکرِ جہاد النبیؐ صلی اللہ علیہ وسلم

حُنین و بدر کے میدان شاہد ہیں
کہ جنّت مومنوں کو خون کے قطروں سے ملتی ہے
حنین و بدر سے اسلام کی قوّت بڑھی اتنی
ہر اک ظلمت کدہ امن و اماں سے ہوگیا روشن
محمد مصطفیٰؐ کی فوج کو وہ قوّتِ دیں تھی
جو کافر تھے انہیں کے واسطے اموات کی فصلیں
اگا کرتی تھیں میداں میں
وہ نیزوں کے قلم سے خط لکھے کس نے؟
فساد و ظلم کی کھیتی کے دہقاں کفر کے حامی
نظامِ عدل کے بانی رسول اللہؐ کے ساتھی
کسی سیسہ پلی دیوار کی مانند لڑتے تھے
بقائے مرکزِ ملت کی خاطر جنگ کرتے تھے
اُنہیں غزوات کا حاصل ہے امنِ عالمِ انساں
ہوائے نصرتِ غیبی فتح مندی لئے آئی
حضورِ سرورِ عالمؐ نے ملت کی حفاظت کی
کہ جیسے شیر بچوں کو نیستاں میں چھپاتا ہے

دُعائیہ

کبھی اہلِ دول کے سامنے دامن کو پھیلایا
کبھی اپنی ہوس کو پیکرِ شعر و سخن دے کر
متاعِ عمر ضائع کی
تری توصیف ہے عمرِ پشیماں کی نئی منزل
تری یادیں مرے داغِ ندامت کو مٹائیں گی
مجھے داغِ معاصی ناگ بن کر ڈستے رہتے ہیں
کہ میں نے دین کی قیمت پہ دُنیا کا کیا سودا
مگر رشتہ مرا تجھ سے کبھی ٹوٹا نہ ٹوٹے گا

یہ پیمانِ محبت قوتِ دل ہے
ترا دستِ کرم گلہائے بخشش سے مرے دامن کو بھر دے گا
مری توقیر کا ذریعہ ترے دربار سے نسبت
میں خاکِ خشک ہوں گرمی کا مارا ہوں
ترے لطف و کرم کی بارشِ پیہم
مجھے سر سبزیوں سے آشنا کر دے

مناجات

خداوندا محمدؐ مصطفیٰ کے ابرِ رحمت کو
مری ہستی پہ برسا دے

حُدی خوانی سے رستے سہل ہو جائیں
نسیمِ صبح جب شاخوں کو جھولا دے
مرے نغمے شفاعت کا وسیلہ ہوں
مجھے صدقِ ابوبکرؓ و علیؓ دے دے
عمر فاروقؓ کا جذبہ عنایت ہو
حیائے حضرتِ عثمانؓ نگاہوں کو بدل ڈالے
بصیریؒ کی ردائے پاک کا سایا ملے مجھ کو
میں اپنے دور کی تاریکیوں کو دور کر جاؤں
قلم کے ساتھ اپنے علم و دانش سے
محمد مصطفیٰ کے نور کو نغموں سے پھیلاؤں
ترے دینِ مبیں کو وسعتِ عالم میں پھیلاؤں
عمل میرا نشانِ راہِ منزل ہو
مرا بچّہ رسولِ پاکؐ کا نقشِ بن کر
ہماری ناتمامی کو مٹا ڈالے

تو حرفِ دُعا ہے مرے مولا، مرے آقاؐ
رحمت کی نوا ہے مرے مولا، مرے آقاؐ

گرداب بلا میں ہے ترا نام سفینہ
تو موج کشا ہے مرے مولا، مرے آقاؐ

اِس حدِ مکانی سے گزر کر ترا نغمہ
میں نے بھی سنا ہے مرے مولا مرے آقاؐ

بکھرے ہوئے لمحوں میں سلامت ہیں دل و جاں
یہ تیری عطا ہے مرے مولا مرے آقاؐ

جو لمحہ تری یاد سے آباد ہوا ہے
اک کنجِ حرا ہے مرے مولا مرے آقاؐ

تسکینِ دل و جاں کی ہر اک صورتِ مطلوب
طیبہ کی ہوا ہے مرے مولا مرے آقاؐ

یہ گنبدِ خضریٰ کے قریں طائرِ تنہا
کشفیؔ کی نوا ہے مرے مولا مرے آقاؐ

ہے یادِ تری اپنا ہُنر[1] سیّدِ عالم
اور اشکِ جگر تاب، گہر سیّدِ عالم

امکان مرے تیری نبوت کا ثمر ہیں
تو مطلعِ امکانِ بشر سیّدِ عالم

آمد تری، انوار کا اعلانِ جلی ہے
آفاق میں تو بانگِ سحر سیّدِ عالم

عثمانؓ و ابوبکرؓ و علیؓ کی تجھے سوگند
مِل جائے مجھے میری خبر سیّدِ عالم

تابندہ و بےباک کرے میرے جنوں کو
فاروقِؓ معظّم کی نظر سیّدِ عالم

کشفیؔ کے لبوں پر ہے حدیثِ شبِ اسریٰ
اس پر ہو عنایت کی نظر سیّدِ عالم

[1] ہنر بمعنی متاع

وہ ایک نام جو آبِ حیات ہے لوگو
مرے لہو میں مری آرزو میں زندہ ہے

صفات و ذات کے پردے اٹھا دیئے جس نے
مری شراب اُسی اک سبو میں زندہ ہے

دیارِ شرق سے لے کر دیارِ مغرب تک
یہ مشتِ خاک تری آرزو میں زندہ ہے

تمہاری یاد ہے جس کے لئے مثالِ حرا
وہ کس وقار سے اس ہاؤ ہو میں زندہ ہے

(نذرِ وقار صدیقی مرحوم)

طیبہ کی ہوا مدحتِ سرکار کی قاصد
اُن کا نہ اشارہ ہو تو ہم کچھ نہیں لکھتے

ہر سانس عبادت ہے محمدؐ کی ثنا سے
رودادِ شہاں، قصۂ جم کچھ نہیں لکھتے

اک اسمِ محمدؐ کے سوا لوحِ ابد پر
دیوار و در و بامِ حرم کچھ نہیں لکھتے

اُس شہرِ محبت کے صحیفوں پہ فرشتے
میرے لئے جز حرفِ کرم کچھ نہیں لکھتے

اِک حرفِ ندامت سے مقدّر کو سنوارا
اس کے سوا یہ دیدۂ نم کچھ نہیں لکھتے

فضا میں اُن کے ہونٹوں کی صدا ہے
مدینے کی سحر ہے اور میں ہوں

حجابِ درمیاں کوئی نہیں ہے
محمدؐ کی نظر ہے اور میں ہوں

حرا سے سبز گنبد تک مسلسل
سفر اندر سفر ہے اور میں ہوں

درِ دل پر صدائے اسمِ احمد
مرا دامانِ تر ہے اور میں ہوں

کبھی قدسی کبھی جامی و اقبال
تماشائے ہنر ہے اور میں ہوں

سکوت و صوت کی منزل سے آگے
تقاضائے دگر ہے اور میں ہوں

مرے اشکوں میں تصویرِ بلالیؓ
محبت کا ہنر ہے اور میں ہوں

مدحتِ شاہؐ کے سیارے فضا میں رقصاں
نکہت و رنگ کی اس موجِ رواں کو دیکھو

سبز گنبد کا مکیںؐ شاہدِ اہلِ ایماں
حلقۂ وقت میں اِس زندہ مکاں کو دیکھو

نام اُنؐ کا مرے ہونے کی دلیلِ اوّل
نام سے اُن کے دھڑکتی ہوئی جاں کو دیکھو

اسمِ احمدؐ سے اندھیروں میں جلائی قندیل
برق تابندہ ہے کشفیؔ کی زباں کو دیکھو

چاند گہن

چاند کا کرب
بے عدد، بے شمار
یہ گہن ہے کہ اُس کے لئے قبر ہے
اِس گھڑی ——
وہ نمازیں
وہ دُعائیں
جو وقت کی قید کو توڑ کر آگئیں
جو کبھی چاند کے واسطے
آدمی کے لئے
ہمارے لئے
محمّد کے سجدوں سے، ہونٹوں سے، بولوں سے
پیدا ہوئیں
چاند کی قبر میں زندگی کی کرن جگمگانے لگی
زندگی کی کرن
چاند کی قبر میں

لبِ عیسیٰ پہ بشارت کی جو مشعل تھا کبھی
عہدِ حاضر کے اندھیروں میں دکھائی دے گا

جسؐ کے ہونٹوں سے ملے لفظ و معانی کو گہر
"وہ مرے حرف کو اک تازہ نوائی دے گا"

جب سوا نیزے پہ سورج کی انی چمکے گی
سایۂ دامنِ احمدؐ ہی دکھائی دے گا

ہر صدا حشر کے میدان میں پتھر ہوگی
نغمۂ مرسلِ آخرؐ ہی سنائی دے گا

میرا دل اسمِ محمدؐ سے سکوں کا مرکز
ذہنِ بے مایہ بھی اب اُس کی دہائی دے گا

ظلمت نے چراغ اپنے بُجھائے تو ہیں لیکن
اک اسمِ محمد تو اُجالے کے لئے ہے

درکار نہیں مجھ کو، کوئی سایۂ رحمت
طیبہ کی ہوا غم کے ازالے کے لئے ہے

خاکِ درِ سرکارؐ سے نسبت ہے کچھ ایسی
عنوان مرے دل کے مقالے کے لئے ہے

بے چہرہ سہی عالمِ اسلام کا امروز
وہ گنبدِ خضریٰ تو حوالے کے لئے ہے

میں خواب میں سرکارؐ کو دیکھوں گا کسی دن
معراج یہی چاہنے والے کے لئے ہے

بشر ہے وہ مگر عکسِ صفات ایسا ہے
کہ کائنات میں تنہا دکھائی دیتا ہے

ہر ایک خلوتِ جاں میں اسی کی محفل ہے
ہر اک شخص کو اپنا دکھائی دیتا ہے

غبارِ تشنہ لبی میں نگاہِ امت کو
اسی کی ذات کا دریا دکھائی دیتا ہے

جہاں میں ذاتِ محمدؐ کے سینکڑوں جلوے
نگاہِ شوق کو کیا کیا دکھائی دیتا ہے

غرورِ کج کلہی تو گدائے احمدؐ کو
فسادِ قلب کا صحرا دکھائی دیتا ہے

۴۲۰۸۷

نعت

"عرش"
"کرسی اور مکاں"
"کائنات"
کتنے بڑے ہیں ـــــ یہ لفظ
اور ان کے مفاہیم ـــــ ہمارا ادراک کائنات کا مقدر ہیں
"ہم" ، "میں" ـــــ یہ لفظ بھی ایسے ہی ہیں
مگر ان کا کوئی مفہوم نہ ہوتا
یہ لفظ ـــ موتی سے خالی صدف کی طرح ہوتے
اگر محمدؐ نہ ہوتے
محمدؐ ـــــ اِن سب لفظوں کا مفہوم ہیں
سلام اُن پر ، دُرود اُن پر

ہر منظرِ مدینہ ختم الرسلؐ کا عکس
رقصاں ہے میرے دل میں چراغاں کیے ہوئے

دیکھے ہے اُنؐ کے عہد کو میری نگاہِ شوق
اشکِ عمرؓ کو زینتِ مژگاں کیے ہوئے

راہِ وفا میں پھول کھلائے بلالؓ نے
اپنے لہو سے خود کو گلستاں کیے ہوئے

[illegible]
[illegible]
[illegible]

[illegible]
[illegible]

ڈاکٹر سید ابوالخیر کشفی

سی-۴- جامعہ نگر
جامعہ کراچی - کراچی ۳۲

شعبۂ اردو ادبیات و لسانیات
جامعہ کراچی

ربیع الاول ۱۴۰۷ھ ابھی ہمارے ماحول اور ہمارے باطن میں سانس لے رہا ہے — یہ وہ موسم بہار ہے جو ہمارے وجود کی ویرانیوں کو شادابی میں بدل دیتا ہے۔ اس مہینے میں ہمارے وجود نے اپنے خیالوں میں روشنیوں اور خوشبوؤں کے اس شہر میں ابد آثار لمحات گزارے ہیں — ان لمحوں میں مرشدی سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہٗ کے کلمات رُشد اور ذات گرامی، مولانا محمد عبدالرشید نعمانی کے گوشہ ہائے چشم کی نمی، ڈاکٹر سید حامد حسن بلگرامی کے دل کی دھڑکنیں، محترم حکیم محمود احمد برکاتی کی جمالی کیفیات اور سید ابوالحسنات حقی سلمہٗ کا جذب — یہ سب دولتیں ہمارے ساتھ رہی ہیں — اللہ ہم سب کو اس شہر رُشد و نور میں ہمارے اجسام کے ساتھ یک جا کر دے

اللہ تعالیٰ میر مسعود سلمہٗ اور ابوالواحد عاکف سلمہٗ کو اپنی برکتوں سے نوازے کہ ان کی محنت سے یہ صفحات ربیع الاول میں شائع ہو رہے ہیں۔

سید ابوالخیر کشفی

۱۹ ربیع الاول ۱۴۰۷ھ